موت کی خوشی

البرٹ کامیو

ALBERT CAMUS



A HAPPY DEATH

موت کی خوشی

مصنف: البرٹ کامیو، ترجمہ: ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی

City Book Point

Naveed Square, Urdu Bazar
Near Muqadus Mosque Karachi
Ph:2762483 Cell:03222820883

بیاد

HASAN-DEEN

نام کتاب	:	موت کی خوشی
ترجمہ	:	ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی
ناشر	:	سٹی بک پوائنٹ، کراچی
کمپوزنگ	:	شیراز گرافکس
مطبع	:	برکت اینڈ سنز
تعداد	:	500
اشاعت اول	:	2008ء
قیمت	:	150 روپے

انتساب

ہم سفر نسیم صدیقی کے نام
جو دخل در معقولات سے مبرا ہیں

فہرست

پیش لفظ

''کیا موت کی خوشی ممکن ہے؟''

یہ سوال البرٹ کامو(Albert camus) کی کتاب A Happy death کا مرکزی خیال ہے۔جس کا جواب اس نے دینے کی کوشش کی ہے۔یہ کتاب مصنف کی موت کے بعد شائع ہوئی اور دنیا نے اسے ایک عظیم ادبی کارنامے کے طور پر لیا۔کامو فرانسیسی زبان کا لکھاری تھا۔مغربی ادبی دنیا میں بڑا نام Ahappy death کا انگریزی ترجمہ Richard Howard نے کیا اور میں نے انگریزی ترجمہ سے اسے اردو میں منتقل کیا ہے۔مختلف زاویے سے اس کتاب پر غور کیا جا سکتا ہے۔البرٹ کامو کی مشہور کتاب outside کے پہلے خاکے یا پھر ایک سوانحِ ناول کے طور پر یہ ایک عمدہ تحریر ہے۔کتاب کا آغاز ایک قتل سے ہوتا ہے اور ختم مرکزی کردار پیٹرس میں مرساں کی موت پر ہوتا ہے۔درمیان میں مرساں کی الجیریا میں گزری ہوئی زندگی کا احوال ہے۔مارتھا اور پراسرار لنگڑائے زیگریو سے تعلقات کا تذکرہ۔زیگریو کے قتل کے بعد وہ پراگ بھاگ جاتا ہے۔پھر وسطی یورپ کا چکر کاٹ کر الجیر واپس۔اس کے زندگی کے دوسرے کردار کیتھرین،روز اور آخر میں لوسی کے علاوہ دیگر کردار اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔مصنف نے مرساں کی دوسری زندگی کے تجربہ کو فلسفیانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ وہ کیسے مجلسی زندگی اور جوگی بن کر خوشی کی تلاش کرتا ہے۔آخر کار اس نے خوشی کو اپنے طور پر پالیا اور اپنی موت

میں بھی اسے برقرار رکھا۔ کیسے؟ یہ آپ ''موت کی خوشی'' کو پڑھ کر سمجھ سکیں گے۔

اب کچھ باتیں البرٹ کامو کے متعلق کامو 1913 میں الجیریا میں پیدا ہوا۔ وہ ماں باپ کی طرف سے فرانسیسی اور ہسپانوی نژاد تھا۔ شمالی افریقہ میں وہ پلا بڑھا۔ وہ مختلف کام کرتا رہا۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ وہ الجیریا کی فٹ بال ٹیم کا گول کیپر بھی رہا تھا۔ فرانس آ کر اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ جرمن کے فرانس پر قبضہ کے دوران وہ بہت متحرک تھا اور مشہور اخبار Combat کا ایڈیٹر ہو گیا تھا۔ جنگ سے پہلے اس نے ایک تمثیل Coligula کے نام سے تحریر کیا 1931 میں۔ اور پھر جنگ کے دوران اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔

Etrange نے اور Le mythe de sisphe۔ صحافت اور سیاست کو اس نے خیر باد کہہ کر پوری توجہ لکھنے پر لگادی۔ اور پوری دنیا میں نام پیدا کیا۔ یکے بعد دیگرے اس کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔

ادب کا نوبل انعام اسے 1957 میں عطا کیا گیا۔

جنوری 1960ء میں ایک سڑک کے حادثہ میں اس کا انتقال ہوا۔

مترجم

ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی

بابِ اول

صبح کے دس بجے تھے۔ پیٹرس مرساں زیگریو ولا کی جانب ثابت قدمی سے چلا جارہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ وہ وقت ہے کہ گھر کا ملازم سودا سلف لینے کے لئے بازار جاچکا ہوگا۔ زیگریو ولا ویران پڑا ہوگا۔

یہ ماہِ اپریل کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ٹھنڈک مگر چمکدار دھوپ کے ساتھ سورج اپنی پوری آب وتاب سے آسمان پر موجود تھا مگر دھوپ میں شدت نہ تھی سڑک خالی اور سنسان تھی۔ اس کی ڈھلان کی دوسری جانب زیگریو ولا واقع تھا۔ دور پہاڑی پر پائن کے درختوں سے چھن چھن کر سورج کی جھلملاتی روشنی آرہی تھی۔ پیٹرس مرساں ایسے میں اکیلا سڑک پر چلا جارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ تھا۔ صبح کی خاموشی میں سڑک پر اسے صرف اپنے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

ولا کے قریب سڑک کے درمیان میں ایک چھوٹا سا خوبصورت چورہا تھا جس کے اطراف خوش نما پھلواری کے تختے تھے۔ بیٹھنے کے لئے لکڑی کی بنچ لگی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگے خوشنما پھول کھلے آسمان تلے ایسا خوشگوار نظارہ پیش کررہے تھے کہ مرساں ایک بچے کی مانند چندلمحوں کے لئے اس منظر میں کھو گیا اور وہیں رک گیا۔ مگر پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر سڑک کی ڈھلوان پر تیزی سے اترنے لگا۔ ولا کے قریب پہنچ کر وہ چندلمحوں کے لئے گیٹ پر رکا اور اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن لئے۔ اس نے دروازہ کھولا جو لنگڑا زیگریو کبھی بند نہیں رکھتا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا۔ اب وہ درمیانے بڑے ہال سے گزر کر داہنے ہاتھ پر موجود دروازے پر موجود تھا۔ پیٹرس مرساں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اور پھر کسی جواب کے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ زیگریو اندر بالکل اسی انداز سے آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا۔ جس طرح دو دن پہلے مرساں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ پاؤں پر کمبل پڑا تھا اور ایک کھلی کتاب اس کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے مرساں کو نظر اٹھا کر دیکھا۔ مگر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ کھڑکیوں پر پڑے پڑے

سر کے ہوئے تھے۔

درختوں سے چھن چھن کر سورج کی روشنی اندر جھلملاٹ پیدا کر رہی تھی۔ کمرے میں ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

مرساں اپنی جگہ بے حس و حرکت خاموش کھڑا تھا۔ مگر اسے اپنا دل تیزی سے دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ زیگریو کی نگاہیں اس پر تھیں مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ مرساں اب کمرے کی دوسری جانب گیا اور اپنا سوٹ کیس ایک میز پر رکھ دیا۔ وہ زیگریو سے مخاطب نہیں ہوا۔ اسے اپنی ٹانگیں کپکپاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مرساں نے ایک سگریٹ سلگایا۔

زیگریو کی نظریں اس پر برابر لگیں ہوئی تھیں۔ اس نے کتاب بند کر دی۔ مرساں کو اپنی ٹانگیں بے جان سی لگ رہی تھیں۔ وہ سہارا لینے کے لئے قریب موجود درازوں والی میز پر جھک گیا۔ پھر اس نے میز کی ایک دراز کھولی۔ وہاں ایک ریولور ایک سفید لفافے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے لفافہ ریولور کے نیچے سے کھینچ لیا۔ اور ریولور دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔

چند لمحے کے توقف کے بعد اس ریولور اپنے بغل میں دبا لیا اور لفافے کو کھولا۔ اندر سے ایک چوکور سفید کاغذ کا پرزہ نکلا جس پر اوپر کی جانب چند سطریں تحریر تھیں۔ یہ زیگریو کی لکھائی تھی۔ لکھا تھا۔

میں صرف ان لوگوں کو دینے کے لئے کچھ کر رہا ہوں جنہوں نے اب تک میرا خیال رکھا۔

اگر کچھ بچ جائے تو برائے مہربانی ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ جو قید میں ہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے میں کچھ زیادہ امید لگائے بیٹھا ہوں۔ مرساں نے پڑھا اور بغیر کسی جذبات کے اظہار کے اس کاغذ کو دوبارہ موڑ کر لفافہ میں رکھ دیا۔ ہونٹوں میں پھنسی سگریٹ کی راکھ جھڑ کر لفافے پر گری۔ اسے جھاڑ کر مرساں نے لفافہ میز پر ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا۔ پھر زیگریو کی طرف مڑا جس کی نگاہیں اب لفافے پر تھیں۔ اور ہاتھ میں کتاب۔ مرساں جھکا اور میز کی نچلی دراز کو چابی لگا کر کھولا۔ اس نے ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا بنڈل جو اخباری کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے باہر نکالا۔ ایک ہاتھ میں پستول پکڑے ہوئے اس نے کرنسی نوٹ کے بنڈل کو اپنے سوٹ کیس میں ڈالا۔ یہ سو سو نوٹوں کے 20 پیکٹ تھے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ بڑا ہی سوٹ کیس لے کر آیا تھا۔ اس نے ایک پیکٹ واپس دراز میں ڈال دیا۔ اس نے اطمینان سے دراز کو بند کیا۔ آدھا پیا سگریٹ کو بجھایا اور اب سیدھے ہاتھ میں پستول پکڑے لنگڑے زیگریو کی جانب آیا۔ زیگریو کرسی پر بیٹھے ہوئے

موت کی خوشی

گردن اٹھا کر برابر کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں سڑک پر ابھی ابھی کوئی گاڑی گزری تھی۔ وہ اپریل کی اس خاموش اور اداس صبح کو کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ اسے اپنی دائیں کنپٹی پر پستول کی نالی کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے گردن نہیں گھمائی۔ مگر پیٹرس نے جس کی نگاہیں زیگریو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اب پیٹرس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر پستول کی لبلبی دبا دی۔ چند لمحے وہ دیوار کا سہارا لئے کھڑا رہا۔ آنکھیں ابھی تک بند تھیں اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کے کانوں میں آ گیا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ زیگریو کا سر اس کے بائیں کندھے کی طرف جھک گیا تھا۔ اور جسم کرسی پر نیچے کی طرف سرک گیا تھا۔ اب کرسی پر جیتے جاگتے زیگریو کی جگہ ایک بے جان جسم خون میں لتھڑا پڑا تھا۔ مرساں پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ ہمت کر کے کرسی کی دوسری جانب آیا۔ اور پستول کو زیگریو کے بے جان سیدھے میں پکڑا دیا جو لڑھک کر اس کی گود میں آ گرا۔ پٹرس نے زیگریو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی اور اداسی چھائی ہوئی تھی جو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کے چہرہ پر تھی۔

ٹھیک اسی لمحے باہر گیٹ پر کسی گاڑی کی تیز ہارن کی آواز آئی۔ پھر سڑک پر گاڑی کے ٹائر کی تیز رگڑ کی آواز نے ظاہر کیا کہ یہ قصاب کی گاڑی تھی جو اب رخصت ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ انتظار کے بعد مرساں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا دروازے کے ناب کو گھما کر کمرے سے باہر آیا۔ گیٹ سے گر کر وہ باہر سڑک پر آ گیا۔ اور تیزی سے واپس جانے لگا۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ سوائے چند بچوں کے جو چوک میں کھیل رہے تھے۔ وہ چوک سے گزر کر آگے بڑھ رہا تھا اچانک اسے سردی کا احساس ہوا۔ ہلکی سی جیکٹ اسے سرد ہوا سے نہیں بچا رہی تھی۔ اسے دوبارہ چھینک آئی۔ اسے ایسا محسوس جیسے اس کی چھینک کی آواز سے پوری وادی گونج اٹھی ہو۔ اس نے گہری سانس بھری۔ ہلکی بارش میں آس پاس کے مکانات کی لال کھپریل چھتیں ڈھل کر سرخ ہو گئی تھیں۔ ایک چھوٹا ہوائی جہاز اوپر فضا میں اڑ رہا تھا۔ مرساں عجیب خیالوں میں گم تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ انسان بس خوش رہے اور جیسے مگر اس کا اپنا وجود لاتعلق اور بے حس تھا۔ اسے پھر زوردار چھینک آئی اور کپکپی طاری ہو گی۔ اب وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے چل رہا تھا۔ صرف اس کے قدموں کی چاپ بلندی ہو رہی تھی۔ سوٹ کس کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے وہ اپنے کمرہ میں داخل ہوا۔ سوٹ کیس ایک کونے میں رکھ کر وہ بستر پر نیم جان ہو کر گر پڑا اور سہ پہر تک مدہوش رہا۔

باب دوم

ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔گرمیوں کی دوپہر۔ساحل سمندر پر شوروغل تھا۔تیز چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ڈاک یارڈ پر الجیر کے میونسپل ڈپو سے گندم کی بوریاں جہاز پر لادی جا رہی تھیں۔دوسری جانب کچھ عربی ملاح اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ایک ہنگامہ برپا تھا۔اچانک ایک دردناک چیخ کی آواز سنائی دی۔کوئی سرخ لباس میں ملبوس عربی کرتب باز گر گیا تھا اور اسے شدید چوٹ آئی تھی۔اسی دوران تیز سائرن کی آواز بھی فضا میں گونجنے لگی۔ہٹو بچو کی آواز بلند ہونے لگی۔زخمی کرتب باز درد سے چیخ رہا تھا۔ٹھیک اسی لمحے پیٹرس مرساں اپنے دفتر سے باہر آیا۔یارڈ کی گرمی اور کثیف فضا میں پیٹرس کو سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔لوگوں نے زخمی شخص کو اٹھا کر ایک الگ جگہ فرش پر لیٹا رکھا تھا۔اس کے زخم سے خون رس رہا تھا اور وہ درد سے کراہ رہا تھا۔اس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ایک بازو بری طرح کچلا گیا تھا۔مرساں بے حس وحرکت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا زخمی کرتب باز کے بہتے ہوئے خون کو تک رہا تھا۔اس کے دفتر کے ایک کلرک ایمانیول نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا اور تیز رفتاری سے آتے ہوئے ایک ٹرک کے درد سے بچانے کے لئے دھکا دیا۔پھر وہ ٹرک کے پیچھے تیزی سے دوڑا۔پیٹرس بھی اس کے پیچھے بھاگا۔آخر کار ٹرک کی رفتار کم ہونے پر انہوں نے اسے جا لیا پہلے مرساں ٹرک پر چڑھا پھر اس نے ایمانیول کو بھی اوپر چڑھنے میں مدد دی۔اس بھاگ دوڑ میں وہ دھول مٹی سے اٹ گئے تھے۔ہاتھ پاؤں اور منہ بھبوت ہو رہا تھا۔مرساں اور ایمانیول کو ٹرک والے سے کوئی شکایت نہیں تھی وہ مزے سے ٹرک پر بیٹھے گاتے جھومتے چلے جا رہے تھے۔حتیٰ کہ وہ بل کورٹ پہنچ گئے اور چلتے ٹرک سے کود گئے وہ سڑک ڈی لیون پر آگے پیچھے چل رہے تھے۔مرساں ایمونول کے مقابلہ لمبے قد اور کاٹھی کا تھا۔وہ چلتے چلتے اپنے مخصوص پسندیدہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے اور ایک میز کے سامنے کرسیوں پر اطمینان سے بیٹھ گئے اور اپنے آرڈر دیے ہوئے کھانے کو خاموشی سے کھاتے رہے۔باہر کے

مقابلے میں ریسٹورنٹ کے اندر ٹھنڈک زیادہ تھی۔لوگوں کی بات چیت اور برتنوں، پلیٹوں کی کھن کھناہٹ جا رہی تھی۔ہوٹل کا مالک سلیسٹی ایک لمبے قد کا شخص تھا بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ۔وہ ان کو خوش آمدید کرنے آیا۔سینے پر بندھے ایپرن کے نیچے اپنی توند کو کھجلاتے ہوئے وہ ایمانیول سے بولا بوڑھے آدمی۔تمہیں معلوم ہے بوڑھا آدمی کسے کہتے ہیں۔سارے بوڑھے ایک جیسے ہوتے ہیں۔کہتے ہیں ایک صحیح آدمی ہونے کے لئے اسے پچاس کا ضرور ہونا چاہئے۔وہ شاید اس لئے کہتے ہیں کہ وہ خود پچاس سال سے زیادہ کے ہوتے ہیں۔میں ایک ایسے بوڑھے کو جانتا ہوں جو اپنے بیٹے کے ساتھ اچھا وقت گزار سکتا ہے۔وہ اس کے ساتھ شہر جاتا ہے ناچ گھر جاتا ہے۔کہتا میں بوڑھے لوگوں کے ساتھ کیوں میل ملاقات رکھوں۔وہ ہمیشہ اپنی بیماری کا رونا روتے رہتے ہیں اور بتاتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے جگر کی خرابی کے لئے کون کون سی دوائیں استعمال کی ہیں۔ان گھوسٹ بوڑھوں کے مقابلے میں، میں اپنے بیٹے کے ساتھ زیادہ خوشگوار وقت گزارتا ہوں۔ایمانیول نے قہقہہ لگایا۔سلیٹی تم کہتے تو ٹھیک ہو مگر بوڑھوں کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔وقار ہوتا ہے تجربہ ہوتا ہے۔ایمونیول نے سلیسٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہر شخص کا اپنا صرف ہوتا ہے۔اب اس شخص کو دیکھو جب وہ خوب پیسے کماتا تھا تو سر اٹھا کر بات کرتا تھا۔اب جب کہ وہ سب کچھ کھو بیٹھا ہے اس کا سارا غرور ختم ہو گیا۔بہرحال تم اس کو اب بھی کھلاؤ پلاؤ۔سلیسٹی نے ایمونیول سے ہنستے ہوئے کہا۔میں اتنا کمینہ نہیں ہوں جب اس کے پاس مال تھا تو اس نے زندگی سے خوب لطف اٹھایا اب کنگال ہوا بیٹھا ہے۔تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے ایمونیول نے پوچھا۔میں کیا کرتا۔سلیسٹی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔میں شہر سے باہر پر فضا ماحول میں ایک آرام دہ خوبصورت سا چھوٹا بنگلہ بناتا اور اس کی چھت پر اپنا جھنڈا لہراتا اور دیکھتا کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔وہ کہتے ہیں نا کہ چلو ادھر جدھر ہوا چلے۔اس دوران مرساں خاموشی سے کھاتا رہا۔اور ایمونیول اور سلیسٹی کی باتیں سنتا رہا۔پھر ایمونیول نے سلیسٹی سے اپنے جنگ کے زمانے کی داستان چھیڑ دی جو اس نے جنگِ مارین کے زمانے میں لڑی تھی۔انہوں نے مجھے ہر اول دستہ میں آگے بھیج دیا۔میجر جنرل نے آرڈر کیا ''چارج'' اور ہم ایک تنگ گزار راستے میں داخل ہو گئے جہاں دونوں جانب اور نیچے اونچے درخت تھے۔میجر نے ہمیں حملہ کے لئے کہا مگر وہاں تو دشمن نام کا کوئی بھی موجود نہیں تھا۔چنانچہ ہم آگے بڑھتے گئے اور پھر اچانک ہمارے اوپر مشین گنوں سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ہم ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔خون کی ندی

بہہ نکلی اتنا خون کے اس میں ناؤ کھیئی جاسکتی تھی۔ چاروں طرف سے آہ و بکا چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ بہت بھیانک منظر تھا۔

مرساں کھڑا ہو گیا اور اپنے گلے میں گلوبند لپیٹ لیا۔ ہوٹل کا مالک اپنے باورچی خانے کی طرف گیا اور وہاں اس نے ایک بورڈ پر ان کے کھانے کا حساب لکھ دیا۔ یہ ایک طرح کا ادھار کھاتا تھا۔ ہوٹل کے مالک سلیستی کا بیٹا رینی ایک کونے کی میز پر بیٹھا ابلا ہوا انڈا کھا رہا تھا۔ ایمونیول نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بے چارہ بچہ اسے دق ہے۔ رینی زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ حالانکہ وہ زیادہ لاغر نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں چمک نہیں تھی۔ اسی لمحہ ایک گاہک اسے بتا رہا تھا کہ وقت اور صبر کے ساتھ ٹی بی کا مرض ٹھیک ہو جاتا ہے رینی خاموشی سے کھاتا رہا۔ مرساں نے کاؤنٹر کے پاس آکر اپنی کہنی ٹیکتے ہوئے تازہ کافی کا آرڈر دیا۔ گاہک نے رینی سے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ کیا تم جین پراز کو جانتے ہو۔ وہ جو گیس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ بے چارا اب مر چکا ہے۔ اس کا ایک پھیپھڑا بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ وہ ہسپتال سے تنگ آچکا تھا اور گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ اس بیماری کی حالت میں بھی وہ اپنی بیوی کو نہیں چھوڑتا تھا۔ آخر اس کی موت واقع ہو گئی۔ رینی نے اپنے دانتوں کے درمیان پھنسے ہوئے کھانے کے ٹکڑے کو نکالتے ہوئے کہا۔ ہاں آخری دنوں میں حالات جلد خراب ہو جاتے ہیں پھر بھی پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتا۔ گرم کافی کے مگ پر آئی ہوئی بھاپ پر انگلی سے اپنا نام لکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی کی یکسانیت بھی کیا ہے۔ وہی صبح شام۔ وہی کام کاج کام کے بعد ایمونیول کے گانے۔ کافی کا مگ کیا اسی کا نام زندگی ہے۔ آج وہ بہت اوکھا ہو رہا تھا۔

مرساں کافی ہاؤس سے باہر آیا۔ سڑک پار کر کے وہ چلتا ہوا اپنے فلیٹ میں پہنچا۔ اس کی بالکونی کے نیچے ایک قصاب کی دوکان تھی۔ بالکونی پر جھک کر وہ گوشت اور خون کی بو سونگھ سکتا تھا۔ وہ آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ایک سگریٹ کو سلگا کر اس نے اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ایک دو کش کے بعد ہی اس نے سگریٹ بجھا دی اور بے خبر سو گیا۔ وہ جس کمرے میں سویا تھا وہ کبھی اس کی ماں کا کمرہ ہوتا تھا۔ ان کے پاس یہ تین کمروں کا فلیٹ شروع سے تھا۔ اب جب کہ وہ اکیلا تھا تو اس نے باقی دو کمرے اپنے ایک جاننے والے کو دے دیے تھے۔ وہ اسلحہ ساز تھا اور اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ مرساں کی ماں کا انتقال اسی وقت ہوا تھا جب اس کی عمر بمشکل چھپن سال تھی۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی اور زندگی سے لطف اٹھاتی تھی۔ جب وہ چالیس سال کی تھی تو

اسے ذیابطیس کی بیماری ہو گئی۔ اس کے چہرہ کی تازگی جاتی رہی۔ اچھے کپڑوں کا شوق کم ہو گیا۔ پاؤں کی سوجن کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے میں خاصی دقت محسوس کرتی تھی شوگر کی تکلیف نے اس کی آنکھوں پر بھی اثر ڈالا اور وہ آخری وقتوں میں نیم نابینا بھی ہو چکی تھی۔ آخر مرساں کو اپنی تعلیمی پڑھائی چھوڑنی پڑی اور نوکری کرنی پڑی۔ اس بیماری اور معذوری کی حالت میں اس کی ماں نے کافی لمبا عرصہ کھینچ ڈالا۔ لوگ اب اس کی اس حالات سے مانوس ہو گئے تھے اور لگتا تھا کہ وہ ایسی حالت میں جیتی رہے گی مگر کب تلک۔ آخر ایک روز موت نے اسے گلے لگا لیا اور وہ مرساں کو چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی۔

پڑوسیوں نے مرساں سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ پڑوسی سمجھ رہے تھے کہ مرساں کو اپنی ماں کی موت کا بہت غم ہو گا۔ انہوں نے مرساں کے دور اور نزدیکی رشتہ داروں کو سمجھا رکھا تھا کہ وہ دکھاوے کے طور پر بہت زیادہ رنج اور غم کا اظہار نہ کریں میادہ مرساں بہت گہرا اثر لے۔ مگر لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے بہترین لباس میں ملبوس جنازے کے ساتھ بغیر کسی غم کے جذبے سے ہاتھ میں ٹوپی لئے چل رہا تھا۔ کفن دفن کے وقت بھی وہ پرسکون رہا۔ بس وہ تعجب کا اظہار کر رہا تھا کہ اتنے تھوڑے لوگ جنازے میں شریک تھے۔

دوسرے روز لوگوں نے دیکھا کہ اس کے فلیٹ کی کھڑکی پر ایک تختی لٹکی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا۔ کرائے کے لئے خالی ہے۔ اب وہ اپنی مرحومہ ماں کے کمرے میں رہتا تھا۔ اس سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہوئے اس غربت میں بھی ان میں آپس میں ایک محبت کی مٹھاس تھی۔ رات کو وہ ایک ساتھ کھانا کھاتے درمیان میں میز پر ایک تیل کا لیمپ روشن رہتا تھا۔ اور وہ خاموشی سے کھانا کھاتے اس سادگی اور قناعت پسندی میں انجانی سی خوشی پوشیدہ رہتی تھی۔ پڑوسی بھی امن پسند تھے۔ مرساں اپنی ماں کی طرف دیکھتا اور مسکراتا۔ وہ بھی اپنی مسکراہٹ سے جواب دیتی۔ اور وہ پھر خاموشی سے کھاتے رہے۔ کبھی کبھی روشن چراغ دھواں دینے لگتا۔ پھر ماں اس سے کہتی کیا تم نے پیٹ بھر کر کھا لیا۔ کھانے کے وہ سگریٹ پیتا یا پھر کچھ پڑھنے بیٹھ جاتا۔ اور ماں ہمیشہ ڈانٹتی کہ لیمپ کے قریب ہو کر پڑھو ورنہ تمہاری آنکھیں کمزور ہو جائیں گی۔

مگر اب غربت کی تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ جب وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتا تھا تو دراصل وہ اپنے آپ پر ترس کھاتا تھا۔ وہ ایک اچھی اور آرام دہ زندگی گزار سکتا تھا۔ مگر وہ اپنے اسی چھوٹے سے فلیٹ میں غربت کی زندگی سے جڑا ہوا تھا۔ یہاں وہ کم از کم اپنی اس زندگی سے

جڑا ہوا تھا جو اس کی اصلی زندگی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنی تنہائی اور زود رنجی میں ڈوبا رہتا تھا۔ اس کے فلیٹ کے بیرونی دروازے پر ابھی تک وہ پرانی تختی لٹکی ہوئی تھی جس پر اس کی ماں نے نیلی پینسل سے اپنا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں ماں کا وہ آہنی پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر اس کی ماں ریشمی چادر بچھاتی تھی۔ دیوار پر دادا کی پرانی تصویر لٹکی ہوئی تھی جس میں وہ اپنے چہرہ پر چھوٹی سی داڑھی کے ساتھ اپنی بے جان آنکھوں سے مرساں کو گھورتے رہتے تھے۔ آتش دان پر ایک پرانی گھڑی رکھی تھی جو نہ جانے کب سے بند پڑی تھی۔ ساتھ ہی شیشے کا ایک لیمپ جو کبھی روشن نہیں ہوا ہوگا۔ کمرے میں پرانا فرسودہ فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ کپڑے کی الماری پر لگا شیشہ دھندلا گیا تھا۔ ہر شے لاپرواہی سے اپنی جگہ پڑی تھی ایسے جیسے مرساں کے لئے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اس کو اسی طرح رہنے کی عادت ہوگئی تھی ایک مشین کی طرح بغیر کسی شعوری کوشش کے وہ رہے جا رہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں جاتا ہی نہیں تھا جو اس کے لئے اجنبی لگتا تھا۔ دنیا کے لئے اس کا وجود گو ختم ہوگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوتا ہی رہے یہاں تک کہ ہر شے ختم ہو جائے۔ اس کے کمرہ کی ایک کھڑکی سے باہر سڑک دیکھائی دیتی تھی اور دوسری کھڑکی سے ایک دلان جہاں رسی پر لٹکے کپڑے دھوپ میں سوکھتے رہتے تھے۔ اس دلان کی بیرونی دیوار کے پاس چند سنگترے کے درخت ہوا میں جھولتے دکھائی دیتے تھے۔ گرمیوں کی راتوں میں وہ کھڑکیاں کھلی رکھتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں درخت مہیب سائے بناتے تھے۔ ہاں سنگترے کے پھولوں کی مسرور کن مہک ہوا کے دوش پر اس کے اندھیرے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ ساری رات وہ خوشبو میں بسے کمرے میں مدہوش پڑا۔ اس کی آنکھ کھلی مگر آنکھوں میں نیند کا خمار بھرا ہوا تھا۔ جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ پسینے سے شرابور۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی جلدی بالوں میں کنگھی کی تیزی سے نیچے اترا اور ایک ٹرائم میں سوار ہوگیا۔ تقریباً ڈھائی بجے دوپہر وہ دفتر میں تھا وہ ایک بڑے سے کمرے میں کام کرتا تھا جہاں چاروں طرف دیواروں میں تقریباً چار سو سے اوپر خانے طاق بنے ہوئے تھے۔ جن میں جہاز رانی سے متعلق اور سامان کی آمد و ترسیل وغیرہ کا حساب کتاب اور جہاز کی آمد و رفت کے ریکارڈ کے ضروری کاغذات رکھے جاتے تھے۔ ڈاک یارڈ میں کام کرتے ہوئے یہ جگہ اس کی پسندیدہ تھی کیونکہ ایسے یہاں بڑے افسروں سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ اس ریکارڈ کے دفتر میں اس کے ساتھ تین خواتین بھی کام کرتی تھیں۔ ایک خاصی قبول صورت تھی اور حال میں ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ دوسری کنواری اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ تیسری ایک پکی عمر کی اور مضبوط خیالات کی

خاتون تھیں۔ مرساں کا سارا دن ان لوگوں سے واسطہ رہتا تھا۔ ہر طرح کی بات چیت ہنسی مذاق اور ساتھ ساتھ کام بھی جاری رہتا تھا۔ وہ اپنی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ناروے سے آیا ہوا ایک جہاز بڑے بڑے لکڑی کے تودے اتار رہا تھا۔ باہر دوسری طرف ساحل پر مزدوروں کا شور و غل اور سمندر کے موجوں کی تھلملاہٹ دونوں مل کر عجیب سی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ چھ بجے شام کی گھنٹی بجی اور اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی۔ یہ ہفتہ کا دن تھا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا بستر پر لیٹ گیا اور رات کے کھانے کے وقت تک سوتا رہا۔ وہ اٹھا تو اسے خیال آیا کہ وہ ڈبل روٹی تو لانا بھول گیا ہے۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے چند انڈے ابالے اور انہیں کھایا تو کچھ تسلی ہوئی اور پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر بے سدھ ہوگیا۔

دوسرے دن وہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک پڑا سوتا رہا۔ اٹھنے کے بعد وہ نہایا اور نیچے ہوٹل میں کھانا کھا کر دوبارہ کمرے میں واپس آیا۔ ایک رسالے کی ورق گردانی کی۔ وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں آیا۔ یہ ایک چمکدار دوپہر تھی۔ مگر رات کی بارش کی وجہ سے سڑکیں گیلی تھیں۔ وہ بالکونی میں کھڑا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر مزے لے رہا تھا۔

اتوار کا روز چھٹی کا دن۔ لوگ اپنی فیملی کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ سڑک پر ایک رونق تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک ماں اپنی دو جوان لڑکیوں کے ساتھ چلی جا رہی ہیں۔ لڑکیوں نے دیدہ زیب رنگین فراک زیب تن کی ہوئی تھیں۔ ان کا باپ آگے آگے گلے میں بڑی سے بو لگائے تن کر چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کی نظر اپنے پڑوسی پر گئی جو اپنے تنگ سوٹ اور لال ٹائی میں ملبوس شہر کے مرکز کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ سب کہ سب سینما میں میٹنی شو دیکھنے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ بھری ٹرام میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر جیسے جیسے شام گزرتی گئی سڑک پر رش کم ہوگیا۔ پھر جب فلم شو کا وقت ختم ہوا تو سڑک اور ٹرام پر لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا۔ لوگ جو فٹ پاتھ پر چلتے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ آپس میں پرجوش طریقے سے محو گفتگو تھے۔ بچے تھکے تھکے دکھائی دے رہے تھے۔ مرساں نوجوان کے اندازِ گفتگو سے اندازہ لگا سکتا کہ انہوں نے کیسی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ دل پھینک نوجوان لڑکے آپس میں خوش گپیوں کے ساتھ آتی جاتی لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کوئی جملے بھی کس رہے تھے۔ کچھ لڑکیوں کی طرف سے جوابی ہنسی بھی ملتی تھی۔ مرساں اپنی بالکونی میں کھڑا صرف اپنی نظروں سے ان مناظر کا مزہ لے رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنے کو تازہ دم

کرنے کے لئے ریسٹورنٹ میں چائے کافی پینے کے لئے جا رہے تھے۔ رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا۔ اسٹریٹ لائٹ آن ہو چکی تھیں۔ شام کی رونقیں رات کے اندھیرے اور خاموشی میں ڈوب رہی تھیں۔ مرساں بالکونی میں کھڑے کھڑے تھک چکا تھا۔ اسے اب بھوک مار رہی تھی۔ وہ نیچے گیا اور کھانے کے لئے میکرونی لے کر آیا۔ کچھ اور کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ اس نے اپنا ڈنر بنایا اور کھایا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایک سگریٹ سلگا کر دوبارہ بالکونی میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ منچلے رات کی ٹھنڈک میں چسکی لگا کر ٹہلنے نکلے ہوئے تھے۔ مرساں کو سردی محسوس ہوئی وہ بالکونی سے واپس کمرے میں آیا۔ کھڑکی بند کی۔ وہ آ کر اس دھندلے آئینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا جس میں اس کا چہرہ ہمیشہ اداس دکھائی دیتا تھا۔ سوائے ان دنوں کے جب مارتھا اس سے ملنے آئی ہوئی ہوتی یا وہ اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ کر مارتھا سے ملنے جا رہا ہوتا تھا۔ وہ اس وقت بھی کچھ خوش دکھائی دیتا تھا جب کبھی وہ تیونس میں مقیم لڑکیوں کے خط کا جواب لکھ رہا ہوتا۔ اس کی زندگی میں اب اداسی ہی اداسی تھی۔

اس دھندلے آئینہ کی طرح جو آتش دان پر بجھے ہوئے لیمپ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

ایک اور اتوار گزر گیا مرساں نے سوچا۔

موت کی خوشی

باب سوم

جب کبھی کسی شام مرساں مارتھا کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بازار کی سیر کر رہا ہوتا تو اسے مارتھا کے چہرے پر پڑنے والی جھلملاتی روشنی بڑی حسین لگتی تھی۔ مارتھا کی قربت اسے انجانی قوت اور سکون بخشتی تھی۔ زندگی بہت آسان محسوس ہوتی تھی۔ بازار میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے فخر محسوس ہوتا تھا۔ مارتھا کا حسن و جمال اس پر ایک نشہ طاری کر دیتا تھا۔ مارتھا کے علم کے بغیر اس پر اداسی چھا جاتی تھی جب کبھی وہ مارتھا کی توجہ اپنی طرف سے ہٹی ہوئی پاتا تھا۔ آج رات وہ مارتھا کے ساتھ سینما جاتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا تھا۔ وہ لوگ فلم شروع ہونے سے کچھ پہلے پہنچے۔ ہال میں پہلے مارتھا آگے آگے داخل ہوئی۔ وہ شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی اپنی سیٹ تک پہنچی۔ لوگ اسے نظر بھر کر دیکھ کر دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کر رہے ہوں گے۔ یہ تاثر اس کے مسکراتے چہرہ پر تھا۔

مرساں اس کے پیچھے ہاتھ میں اپنا ہیٹ پکڑے سکون سے چل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خود نمائی جھلک رہی تھی۔ گویا ہال میں موجود لوگ اسے مارتھا کے ساتھ دیکھ کر جل رہے ہوں گے۔ اس نے آگے بڑھ کر مارتھا کی سیٹ کو جھکایا تا کہ مارتھا آرام سے بیٹھ سکے۔ جس لمحے وہ بیٹھ رہی تھی اس وقت اس نے مڑ کر ایک شخص کو دیکھا اور مسکرائی کون ہے وہ۔ کیا تم اسے جانتی ہو۔ مرساں نے بے اعتنائی سے پوچھا۔ مارتھا نے کمال بے نیازی سے کہا اچھا وہ۔ کیا تمہارا جاننا ضروری ہے۔ نہیں تو۔ مرساں نے بہ حالت مجبوری کہا۔ اس نے مڑ کر اس شخص کو دیکھا جو مارتھا کی پشت پر ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس شخص کے تعلقات مارتھا سے ضرور رہے ہوں گے۔ مرساں کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے کو تھے کہ فلم شروع ہونے کی آخری گھنٹی بجی۔

اب سے کچھ دیر پہلے جب وہ مارتھا کے ساتھ سینما دیکھنے آیا تھا تو اس کے خیالات کتنے مختلف

تھے۔وہ مارتھا کے ماضی کو کسی حد تک جانتے ہوئے بھی اسے بُھلا بیٹھا تھا اور فی الحال اس کے ساتھ خوش تھا۔مگر اب اس سینما ہاؤس میں مارتھا کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا تو اسے اس بات کا دکھ کے ساتھ احساس تھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک شخص بیٹھا مارتھا کو دلچسپی سے دیکھ کر مزے لے رہا تھا جو یقیناً مارتھا کے ساتھ کبھی نہ کبھی سو بھی چکا ہوگا۔گو فلم شروع ہو چکی تھی مگر وہ اپنے سوچوں میں غم انگیز سوچوں میں گم تھا۔وہ اپنے وجود کو ٹوٹتے پھوٹتے محسوس کر رہا تھا۔جب اس کی آنکھ کھلی تو سینما کے پردے پر ایک تیز رفتار موٹر کار الٹ رہی تھی۔گاڑی کا ایک پہیہ ہوا میں تیز رفتاری سے گھوم رہا ہے اور پھر آہستہ آہستہ رک رہا تھا۔بالکل اسی طرح جیسے مرساں کے دل و دماغ میں بے بسی اور نفرت کی ایک لہر اٹھی تھی اور پھر ٹھنڈی پڑ گئی۔مگر وہ اسی کرب کی کیفیت میں مارتھا سے یہ سوال کر ہی بیٹھا کہ وہ شخص واقعی کبھی تمہارا چاہنے والا تھا۔

"ہاں" مارتھا نے سپاٹ سا جواب دیا۔مگر مجھے فلم دیکھنے دو۔

مرساں کی ملاقات مارتھا سے چند ماہ پہلے ہوئی تھی۔پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔اس کی خوبصورتی اس کی جمالیات نے اس پر سحر کر دیا تھا۔اس کی چمکیلی سنہری آنکھیں،اس کے ہونٹوں کی بناوٹ اور اس پر لپ اسٹک اور چہرہ پر انجانی سے کشش۔وہ کوئی دیوی یا کسی سنگتراش کا مجسمہ لگ رہی تھی۔مگر اس کی آنکھوں میں عورت کی مخصوص ناقص العقلی جھلکتی تھی۔جس سے اس کی غیر سنجیدگی اور بے اعتنائی کا اظہار ہوتا تھا۔

مارتھا سے پہلے جب کبھی بھی مرساں نے کسی عورت کے ساتھ وقت گزارا اور اس نے اس کو راضی پایا تو مرساں کے ذہن میں یہ بات واضح رہتی تھی کہ محبت اور جسمانی ملاپ کا اظہار ایک ساتھ ہونا چاہئے کیونکہ اس کو آغوش میں لینے سے پہلے اسے انجام کا اندازہ رہتا تھا۔مگر مارتھا سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ہر چیز سے بے زار ہو چکا تھا۔اپنے آپ سے بھی۔آزادی اور خود مختاری کی خواہش اس شخص میں پیدا ہوتی ہے۔جیسے اپنی زندگی سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔وہ اس وقت ملی جب اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔مارتھا کو جب پہلی مرتبہ اس نے اپنے بازوؤں میں جکڑا تھا تو اس کے چہرے کے نقوش اس کی آنکھوں میں دھندلا گئے تھے۔مارتھا کہ پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹ کپکپا رہے اور دعوتِ بوسہ دے رہے تھے۔مرساں مارتھا کے تعلقات کے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں سوچ رہا تھا وہ تو اس وقت اس کے ظاہری حسن و جمال سے اپنی مردانہ خواہش پوری کرنے کے جذبات سے مغلوب تھا۔وہ رسیلے ہونٹ جو

وہ مرساں کو پیش کر رہی تھی اس میں کوئی پیغام نہیں تھا سوائے اس کے کہ دونوں کے دل کو قرار آ جائے گا ہونٹ آپس میں پیوست ہونے سے۔بس اسی روز سے وہ اس کی محبوبہ یا داشتہ بن گئی تھی۔شروع شروع میں وہ جذبات سے بے قابو ہو جاتے تھے۔اور بڑی دیر تک بوس و کنار میں کھوئے رہتے تھے۔پھر آہستہ آہستہ ان میں ٹھہراؤ آیا۔کبھی کبھی مرساں بالکل ٹھنڈا پڑ جاتا تھا اور بے رخی اختیار کر لیتا تھا۔مگر ایسا بھی ہوا بھری ٹرام میں سفر کرتے ہوئے اچانک مرساں نے نہ صرف اس کے ہونٹوں کے بوسے لینے شروع کر دیئے بلکہ انہیں کاٹنے بھی لگا۔تمہیں کیا ہو گیا تھا اس نے بعد میں مرساں سے پوچھا۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بس کچھ بدتمیزی کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔یہ کہہ کر وہ پھر سنجیدہ ہو گیا۔مارتھا اس کی نفسیات کو سمجھ نہ پائی۔

مارتھا کسی فرم میں سیکریٹری تھی۔اسے مرساں سے محبت نہیں تھی مگر وہ اس میں دلچسپی رکھتی تھی جب تک مرساں اسے ورغلانے میں لگا ہوا تھا۔جب مرساں نے مارتھا کا تعارف ایمونیول سے کرایا تو اس نے مارتھا کو بتایا کہ مرساں ایک اچھا شخص ہے۔اس میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتا۔لوگوں کو اس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم کہ وہ دراصل کس قماش کا شخص ہے۔مارتھا نے بھی اسے زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ اسے اپنی آغوش میں خوش رکھتا تھا۔وہ مارتھا سے زیادہ توقعات بھی نہیں رکھتا تھا۔وہ جب بھی چاہتی تو اپنے آپ کو مرساں کے سپرد کر دیتی تھی۔بس مارتھا کو اس بات کی پریشانی تھی کہ وہ اس بندے کی کمزوریوں کو نہیں پکڑ پائی تھی اب تک۔

مگر اس رات سینما سے باہر آتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مرساں کو کون سی بات دکھ پہنچا سکتی ہے۔مگر اس نے اس کا اظہار اس سے نہیں کیا۔وہ ساری رات اس کے ساتھ بستر میں لیٹی رہی۔مگر مرساں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔اس کے بعد مارتھا اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتی رہی یہ بتا کر کہ وہ دوسرے مردوں سے بھی تعلقات رکھتی ہے۔

دوسرے دن اپنے عام معمول سے ہٹ کر مارتھا اپنے کام سے واپس آنے کے بعد مرساں کے کمرے میں واپس آئی۔وہ بے خبر سو رہا تھا۔مارتھا اس کو جگائے بغیر آہنی پلنگ پر اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی اور دلچسپی سے اس کے برہنہ جسم کو دیکھنے لگی۔وہ مرساں کی گہری نیند میں پرسکون سانس لینے کے عمل سے سینے اور پیٹ میں پیدا ہونے والے زیر و بم کو دیکھ رہی تھی اس کے بال پیشانی پر پھیلے ہوئے تھے۔دونوں بازو اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ایک پاؤں مڑا ہوا تھا۔ایسا

لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی تنہا دیوتا کسی اجنبی سرزمین پر محوِ خواب ہو۔اس کے سوئے ہوئے نیم وا ہونٹ کو گھورتے ہوئے مارتھا کے اندر اسے پیار کر لینے کی خواہش پیدا ہوئی ٹھیک اسی لمحے مرساں نے اپنی سوئی ہوئی آنکھوں کو نیم وا کیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں یہ کہتے ہوئے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کوئی مجھے سوتے ہوئے دیکھتا رہے۔تکتا رہے۔مارتھا نے اس کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے اس سے لپٹ گئی اپنے مرمریں بازو اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹ سے پیوست کر دیے۔مرساں کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔اور ڈارلنگ تمہارا ایک اور انداز۔مجھے ڈارلنگ مت کہو۔پلیز میں تمہیں پہلے بھی منع کر چکا ہوں۔وہ اس کے ساتھ بغل میں لیٹ گئی۔تمہاری ان باتوں سے مجھے کوئی یاد آ رہا ہے۔کون۔یہ یاد نہیں آ رہا ہے۔مارتھا نے مرساں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

مرساں نے اپنے پاجامے کو اوپر چڑھاتے ہوئے مارتھا کی طرف اپنی پیٹھ کر لی۔اس کی ان عجیب اداؤں میں مارتھا کو فلم کے ایکٹر یاد آ جاتے۔وہ اپنی ان حرکتوں سے مارتھا پر اثر انداز ہوتا تھا۔مگر وہ خود مارتھا کی بعض حرکتوں سے کبھی کبھی چڑھ بھی جاتا تھا۔مارتھا مرساں کی پیٹھ سے لپٹ گئی اور اس کے جسم کے لمس کی گرمی اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔اندھیرا ہوتا جا رہا تھا اور کمرے میں سائے پھیل رہے تھے۔اسی بلڈنگ میں کہیں سے بچے کی رونے کی آواز آ رہی تھی۔بلی کی میاؤں میاؤں اور دروازے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔باہر سڑک پر سرکاری لیمپ روشن ہو گئے تھے۔

اب اکا دکا ٹرام کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔پڑوس سے بالکونی کے راستے گوشت بھوننے کی اشتعال انگیز خوشبو کے جھونکے آ رہے تھے۔مارتھا کو نیند آ رہی تھی۔مگر وہ بے چین تھی۔اس نے پوچھا کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔کیا نہیں ہو۔یہ تو صرف کل کی بات تھی اسی لیے میں آئی ہوں۔کیا تم مجھ سے بات نہیں کرو گے۔اس نے مرساں کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔مگر وہ بے حس اور حرکت رہا۔پھر بولا مارتھا تم اس آدمی کو جانتی ہو؟نہیں میں تو مذاق کر رہی تھی۔میرے اس سے کبھی تعلقات نہیں رہے۔نہیں۔ہاں واقعی نہیں۔پھر مرساں کچھ نہیں بولا وہ مارتھا کی مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔وہ بستر سے اٹھا کھڑکی کھولی اور دوبارہ بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔مارتھا اس سے لپٹ گئی۔اپنے دونوں بازو اس نے اس کی کھلی قمیض کے اندر ڈال دیے اور اپنی نازک انگلیوں سے اس کے پستان کی گھنڈیوں کو مسلنے لگی۔آخر کار اس نے مارتھا سے پوچھ ہی لیا ''تمہارے اب تک

کتنے چاہنے والے رہے ہیں؟''

اب ایسی باتیں تو نہ کرو تم۔

مرساں خاموش رہا۔شاید دس رہے ہوں۔مارتھا نے کہا۔اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔کیا میں انہیں جانتا ہوں۔اسے مارتھا کے چہرے پر ایک سفید دھندسی نظر آئی۔بالکل ایسے ہی جیسے ہم آغوش ہوتے وقت اسے دکھائی دیتی تھی۔کچھ کو تم جانتے ہو جو یہاں آس پاس ہیں۔اس نے اپنا چہرہ مرساں کے کندھے پر رکھتے ہوئے ایک معصوم لڑکی کی آواز میں کہا۔جیسا کہ وہ اس کو خوش کرنے کے لئے کرتی تھی۔اچھا اب میری بات غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔وعدہ کرو کہ تم مجھے ان کے نام بتاؤ گی۔اور ان کو بھی دکھاؤ گی جنہیں میں نام سے نہیں جانتا اگر وہ کبھی ہمیں سڑک پر ملے...... مارتھا نے اپنے آپ کو مرساں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ارے نہیں۔اسی لمحے ایک تیز رفتار گاڑی ہارن بجاتے ہوئے نیچے سے گزری۔کہیں دور ٹرام کے پہیوں کی رگڑ سنائی دی۔سنگار میز کے اوپر لگے ہوئے سنگ مرمر پر رکھی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دی۔مرساں نے تحکمانہ آواز میں کہا کہ یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ لوگ کون ہیں تو میں ہر اس شخص میں شک کر سکتا ہوں جو تمہیں دیکھ رہا ہو۔میں حیران ہوں گا اور سوچتا رہوں گا اور یہ حقیقت ہے میں بہت زیادہ سوچتا ہوں۔پتا نہیں تم میری بات سمجھ بھی رہی ہو یا نہیں۔

وہ سمجھ رہی تھی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے ان کے نام بھی بتائے۔ان ناموں میں صرف ایک نام ایسا تھا جو مرساں نہیں پہچان پایا۔آخری نام جو اس نے لیا اسے وہ جانتا تھا۔اس کے بارے میں اس نے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا کیونکہ اس میں مردانہ کشش تھی اور دل پھینک عورتیں اس پر مرتی تھیں۔عشق اور محبت کے بارے میں جو بات مرساں کو حیران کرتی تھی وہ یہ کہ کم از کم پہلی مرتبہ یا بعد میں بھی بے تکلفی اور شناسائی ہو جانے کے باوجود ایک عورت کس طرح اس حقیقت کو قبول کر لیتی ہے کہ اس کے اپنے جسم میں کسی اور کا کوئی جسمانی حصہ اس کا اپنا حصہ بن جائے۔اس کے وجود میں سما جائے۔وہ سوچتا تھا شاید جذبات کی مدہوشی میں سپردگی ہی محبت کے جذبہ کا صحیح اظہار ہے۔مارتھا بستر پر پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھی تھی۔پھر اس نے اپنی ایک ٹانگ دوسری پر رکھ لی۔اس نے اپنے پاؤں سے سینڈل اتار کر پلنگ کے نیچے رکھ دیے۔مرساں اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اسے اپنا گلہ خشک ہوتے ہوئے محسوس ہوا۔اس کے پیٹ میں ایک عجیب

سے مروڑ ہونے لگی۔اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا کیا تم نے رینی کے ساتھ اس طرح کیا تھا۔مارتھانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔فضول باتیں مت سوچو۔ہم نے صرف ایک مرتبہ کیا تھا۔اچھا۔اور ہاں میں نے پاپوش بھی نہیں اتارے تھے۔

مرساں کھڑا ہوگیا۔اس نے دیکھا کہ مارتھا بستر پر چت لیٹی ہے اپنے پورے کپڑوں کے ساتھ۔پھر آہستہ آہستہ اس نے بغیر کسی جھجک کے اپنے آپ کو ان سے الگ کیا۔مرساں چیخا بکواس مت کرو اور جا کر بالکونی میں کھڑا ہوگیا۔مارتھانے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا'اوڈارلنگ'اور اپنے جرابے پہنی ہوئی ٹانگوں کو بستر سے نیچے لٹکادیں۔وہ بالکونی میں کھڑے ہوئے باہر اسٹریٹ لائٹ میں ٹرام کی پٹڑی کو چمکتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔اس نے اس سے پہلے اپنے آپ کو مارتھا کے اتنے قریب نہیں پایا تھا۔اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس نے مارتھا کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا ہے۔پھر بھی اس کا غرور اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔وہ مارتھا کے پاس واپس آیا اور اس کے کان کے گرم لو کو اپنی انگلیوں سے مسلتے ہوئے بولا۔اور وہ زیگریو۔وہ کون ہے صرف وہ ہے جسے میں نہیں جانتا۔اچھا وہ مارتھانے شرارت سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا میں تو اب بھی اس سے کبھی کبھی ملتی ہوں۔مرساں نے اس کے کانوں کو اور زور سے مروڑا۔وہ زندگی میں پہلا تھا۔تم سمجھا کرو اس وقت میں نابالغ تھی۔اور وہ عمر میں زیادہ۔اب وہ معذور ہے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹی جاچکی ہیں۔اکیلا اور تنہا رہتا ہے۔وہ اچھا پڑھا لکھا شخص ہے مجھے کبھی کبھی اس کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔بس اب وہ سارا دن پڑھتا رہتا ہے۔تب وہ ایک طالب علم تھا۔ہنسی مذاق کرنے والا۔وہ بھی تمہاری طرح مجھے سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔مرساں کچھ سوچنے لگا۔مارتھا دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔کچھ لمحے کے بعد مرساں بھی اس کے برابر میں بستر پر بیٹھ گیا اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں پر جھک گیا۔مارتھا ایک پالتو جانور کی طرح اس کے حوالے تھی مگر اس نے صرف بوسے لئے۔پھر جب وہ مارتھا کے گھر گیا تو اس نے زیگریو کی بات کی۔میں نے تمہارے بارے میں زیگریو کو بتایا۔میں نے اس کو بتایا کہ میرا محبوب مرساں بہت مردانہ وجاہت کا مالک ہے۔زیگریو تم سے ملنا چاہتا ہے۔کیوں۔پتا نہیں کہہ رہا تھا مجھے اچھے لوگوں سے ملنا اچھا لگتا ہے۔

عجیب آدمی ہے۔مارتھا دراصل مرساں کو خوش کرنا چاہتی تھی کہنے لگی اب اتنا عجیب بھی نہیں جتنے تمہارے دوسرے دوست ہیں۔کون سے دوست اس نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔وہ

تمہارے بچکانہ بے وقوف دوست۔اچھا وہ تیونس میں میرے دو شاگردوں جن سے میری خط و کتابت رہتی ہے۔زندگی میں میں نے صرف ان سے خط کے ذریعے رابطہ رکھا ہے۔وہ دونوں مارتھا کے گھر کی طرف چلتے رہے۔مارتھا پریڈ گراؤنڈ کے قریب رہتی تھی۔رات ہو چلی تھی۔گھر کی کھڑکیوں سے روشنی آرہی تھی۔

مارتھا نے اچانک سوال کیا۔سنوڈارلنگ میں سمجھتی ہوں کہ تم کسی طور بھی ان چھوٹے بے وقوف شاگردوں کے چکر میں گرفتار نہیں ہوگے۔بالکل نہیں۔مرساں نے اطمینان سے جواب دیا۔پھر زور سے ہنستے ہوئے کہا۔بڑا گہرا سوال ہے تمہارا۔اچھا تو پھر مجھے صحیح جواب دو۔مارتھا نے سنجیدگی سے پوچھا۔اس عمر میں لوگ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ایک دوسرے کو خوش کرتے ہیں بس۔

مارتھا کچھ غیر مطمئن تھی مگر اس نے مرساں کو خدا حافظ کہتے ہوئے پیار کیا اور وہ رات کی تاریکی میں واپس گھر کی طرف لوٹا۔وہ تیزی سے واپس آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ زیگریو سے ضرور ملے گا۔اس کے ذہن میں اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں آرہی تھیں۔وہ مارتھا سے کہے گا کہ وہ اسے زیگریو کے پاس ملوانے لے چلے۔یہی سوچتے ہوئے وہ واپس اپنے گھر کو لوٹا۔پھر جب پہلی مرتبہ اس کی ملاقات زیگریو سے ہوئی تو اسے مایوسی اور ناراضی پیدا ہوئی۔زیگریو نے ہر ممکن طریقے سے ایسی کوئی بات ہونے سے گریز کیا جو آپس میں بدمزگی پیدا کرے اس عورت کی موجودگی میں کہ جس سے وہ دونوں محبت کرتے ہیں۔وہ مارتھا کی تعریف اور خوبیوں میں اس کو بھی شاملِ گفتگو رکھ رہا تھا۔اور جان بوجھ کر ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا۔مگر مرساں سنجیدہ رہا۔پھر جب اس کو تنہائی میں مارتھا سے بات کرنے کا موقع ملا تو اس نے زیگریو سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کھل کر کیا۔تم اور تمہاری سوچ مارتھا نے مرساں کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔

مگر بعد ازاں زیگریو کی وہی بچکانہ ہنسی جس سے مرساں اول اول ناراض ہوا تھا اس کے لئے دلچسپی اور توجہ کی باعث بنی۔اور وہ جلن اور حسد جو شروع میں مرساں کے دل ودماغ میں پیدا ہوئی تھی دور ہوگئی جب اس نے زیگریو کی باتوں کو سنا۔پھر اس نے مارتھا کو تسلی دی کہ خاطر جمع رہو میرے دل میں ایک لنگڑے کے لئے کوئی نفرت نہیں۔اب جب میں تم دونوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔بعد میں وہ خود کبھی کبھی زیگریو سے ملنے اکیلا چلا جاتا تھا۔

زیگریو بہت تیزی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔اور پھر اچانک خاموش ہوجاتا تھا۔اس

کچھ اس وقت ہوسکتا تھا جب میں اپنے وقت کو استعمال کرنے میں آزاد ہوتا۔

وہ جذباتی انداز سے بولا۔ جیسا کہ وہ اکثر ہوجاتا تھا۔ آج زیگریو کی باتوں سے وہ پھر پُر امید ہوگیا تھا۔ اسے یقین ہوچلا تھا کہ بہر حال وہ کسی پر بھروسہ کرسکتا ہے۔ اسنے اپنے جذبات پر قابو پایا اور ایک سگریٹ کو ڈبیہ سے نکالا اور اب اطمینان سے زیگریو سے مخاطب ہوا۔ چند برس پہلے میں بہت پُر امید تھا۔ میرے سامنے سب کچھ تھا۔ لوگ میری زندگی کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ میرے مستقبل کے بارے میں رائے دیتے تھے۔ میں ان کی رائے سے اتفاق کرتا تھا۔ مگر وہ سب میرے لئے اجنبی تھے۔ میں اپنی ذات میں خود کھویا رہتا تھا۔ نہ خوشی نہ اپنی ذات کی نفی۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔ تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ کیوں؟

ہاں سمجھ رہا ہوں۔ زیگریو نے مختصر جواب دیا۔

اور اب جب بھی میرے پاس وقت ہے۔ میں اپنے آپ کو بالکل آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے تپتے ہوئے پتھر پر بارش۔ وہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے مگر دوسرے دن دھوپ کی تپش اسے پھر گرم کردیتی ہے اور شاید رنج اور خوشی کا بھی یہی انداز ہے۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ اسی دوران تیز بارش کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ زبردست گھن گرج کے ساتھ کمرے میں اور اندھیرا چھا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا آسمان اپنا بوجھ اس کمرے میں اتار رہا تھا۔ پھر معذور زیگریو نے پورے وثوق سے کہا کہ کوئی شخص اسی سوچ کا مالک ہوتا ہے جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔ وہ پتھر والی مثال میرے خیالات کی مثال ہے۔ ٹھیک ہی کہتے ہو میرے دوست مرساں نے کچھ تعجب بھرے انداز سے کہا۔ مگر تم کچھ مبالغہ سے کام لے رہے ہو۔ میں ایک کھلاڑی رہا ہوں اور میں خوشی کی تلاش میں دور تلک جاسکتا ہوں۔ زیگریو نے کہا تمہارے لئے یہ بات شاید صحیح ہو ویسے تو صحیح نفسیات یہ ہے کہ انسان اپنے حدود کو سمجھے بہر حال اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ ہمارے لئے اپنے پاس وقت نہیں سوائے اس کے کہ ہم خواہ مخواہ خوش ہونے کی کوشش کریں۔ زیگریو نے اپنے چائے کے پیالے سے صرف ایک دو گھونٹ پینے کے بعد اسے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ مشروب کم مقدار میں پیتا تھا تاکہ اسے پیشاب کی حاجت کم سے کم ہو اور اپنی معذوری کا احساس بھی کم سے کم ہو۔ مرساں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا مجھے افسوس ہے زیگریو مگر ایک عرصہ ہوا کہ میں نے کچھ اہم باتوں کے متعلق کچھ کہا ہو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم یا پھر مجھے ان پر یقین نہیں ہے۔ جب اپنی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر میں غور کرتا ہوں تو مجھے

رونا آتا ہے اور جی چاہتا ہے پھوٹ پڑوں جیسے اس وقت آسمان پھوٹ رہا ہے۔ بارش ہوتی ہے اور پھر دھوپ بھی نکل آتی ہے۔ کبھی دن کبھی رات...... رات میں مجھے وہ ہونٹ یاد آتے ہیں جن کو میں نے کبھی بوسہ دیا ہوا تھا۔ اور پھر اپنا بچکانہ خواہشات کا پاگل پن۔ میں اپنے دھن میں کھویا رہتا تھا۔ اب بھی میں مختلف اوقات میں مختلف موڈ میں رہتا ہوں۔ کبھی کبھی تو کوئی مجھے پہچان بھی نہیں سکتا۔ کبھی سخت مایوسی کا شکار اور کبھی بے انتہا خوش۔ میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو گویا تم ایک وقت میں کئی کھیل کھیل رہے ہوتے ہو۔ ہاں مگر محض شوقیہ نہیں۔ مرساں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ہر مرتبہ میں اپنے اندر خوشی اور غم کا سیلاب محسوس کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے مگر بتا نہیں سکتا کہ میں ہر مرتبہ کتنی سنجیدگی سے زندگی کو لیتا ہوں۔

زیگریو نے مسکراتے ہوئے کہا تو پھر تمہیں کچھ کرنا چاہئے۔ مرساں نے زور دیتے ہوئے کہا مجھے اپنی زندگی میں کمانے کے لئے کچھ کرنا ہی ہے۔ میری نوکری وہ روزانہ کے آٹھ گھنٹے۔ دوسرا کوئی اتنی محنت نہیں کرسکتا۔ یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگالی۔ ماچس کی تیلی اس وقت تک جلتی رہی جب تک اس نے انگلی کو جلا نہیں دیا۔ مجھے معلوم ہے میں نے اپنی زندگی کیسے بتائی ہے۔ مگر اب میں اپنی زندگی کے ساتھ کوئی تجربہ نہیں کرسکتا۔ ہاں مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ کبھی کبھی میں اپنے طاقت ور جذبات سے مغلوب ہوجاتا ہوں۔ جب میں نوجوان تھا تو جذبات میں بہہ جاتا تھا۔ مگر اب معلوم ہے کہ بناوٹ محبت، دکھ سکھ ہی زندگی ہے۔ مگر یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی تقدیر کو ہی اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔ میں زندگی کو خوشی اور جذبات کی ایک دھنک سمجھتا ہوں۔ اور ہر کسی کو یہی سمجھنا چاہئے۔ ہاں زیگریو نے کہا مگر تم اس طرح اپنی پوری زندگی نہیں گزار سکتے ہاں کیونکہ میں ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتا ہوں۔ اور یہی میری خرابی ہے۔ زیگریو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بارش رک چکی تھی۔ رات کی تاریکی نے بادل کے اندھیرے پن کو کھالیا تھا۔ اب کمرہ پوری طرح تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ صرف آتش دان میں جھلملاتی آگ ان کے اداس چہروں کو جھلملا رہی تھی۔ زیگریو بڑی دیر تک خاموش رہا۔ مرساں کے چہرے کو تکتے ہوئے اس نے صرف یہ کہا کہ جو کوئی بھی تمہیں پسند کرتا ہوگا وہ بڑے تکلیف میں ہوگا اور پھر خاموش ہوگیا۔ مرساں نے عجیب نظروں سے زیگریو کو گھورتے ہوئے کہا۔ دوسرے لوگوں کی سوچ کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہوگا میں تو بس حقیقت بیان کررہا تھا کہ تم ایک روز تنہا رہ جاؤ گے۔ اور بس۔ اچھا اب اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ جو کچھ تم نے مجھے اپنے بارے میں

بتایا ہے دلچسپ ہے۔ایک بات خاص طور پر کیونکہ میری زندگی کے تجربے نے اسے صحیح ثابت کیا ہے۔میں تمہیں مرساں پسند کرتا ہوں تمہاری مردانگی کی وجہ سے آج میں محسوس کرتا ہوں کہ میں تم سے کھل کر بات کرسکتا ہوں۔مرساں دوبارہ آہستگی سے بیٹھ گیا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کھڑکی پر پڑے ریشمی پردے سے باہر کی تاریکی میں پیدا ہونے والے ایک امید کی روشن کرن کمرے میں داخل ہوئی ہو اور پورا کمرہ روشن ہوگیا ہو اسے وہ چاندنی راتیں یاد آئیں جو اس کے دل ودماغ میں امید اور خوشی پیدا کردیتی تھیں۔اب اسے ہر شے بڑی اور صاف دکھائی دے رہی تھی۔گھڑی کی ٹک ٹک شاعرانہ نغمگی پیدا کررہی تھی۔اس کی طبیعت میں یقین اور محبت کا جذبہ موجزن ہوگیا تھا۔اسے زیگریو پر اعتماد اور بھروسہ ہوگیا تھا اب وہ کرسی پر آرام سے بیٹھ کر زیگریو کی عجیب وغریب کہانی سن رہا تھا۔

زیگریو نے اپنی بات یوں شروع کی۔مجھے جس بات کا یقین ہے وہ یہ کہ تم بغیر پیسے کے خوش نہیں رہ سکتے۔میں تصنوع اور بناوٹ پسند نہیں کرتا۔اور نہ ہی رومانیت میں بے ہوش رہنا چاہتا ہوں۔حقیقت کی دنیا میں، میں نے محسوس کیا ہے کہ کچھ لوگ خام خیالی میں اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔کون ہے جو نہیں سمجھتا کہ خوشی کے لئے پیسے کی ضرورت ہے۔وہی نہیں سمجھتا جو بے وقوف ہے۔جو جھوٹا ہے اور کسی حد تک بزدل۔تمہیں معلوم ہے مرساں ایک شخص جو پیدائشی خوش حال ہو وہ کبھی الجھتا نہیں۔وہ تقدیر کو عمومی طور پر لیتا ہے۔خوش نہ رہنے پر وہ تقدیر کو دوش نہیں دیتا۔خوشی حاصل کی جاتی ہے، کوشش کی جاتی ہے۔ہاں اس کے لئے وقت درکار ہے۔کبھی بہت زیادہ عرصہ خوشی ایک صبر آزما عمل ہے۔ہم اپنی زندگی پیسہ کمانے میں گنواں دیتے ہیں جب کہ ہمیں اپنا وقت کو خوشگوار گزارنے میں صرف کرنا چاہئے۔وقت، خوشی اور پیسہ یہی وہ اہم مسائل ہیں جن میں ہمیشہ دلچسپی لیتا رہا۔سمجھتے ہوئے بغیر کسی ابہام کے۔زیگریو نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور خاموش ہوگیا۔مرساں باہر آسمان کو تکنے لگا۔اس خاموشی کے دوران باہر کی آواز سنائی دینے لگی۔زیگریو پھر بغیر کسی عجلت کے شروع ہوگیا۔مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بہت سے مالدار لوگوں کو خوش رہنے کا صحیح تصور نہیں۔حقیقی خوشی کسے کہتے ہیں وہ اس سے ناواقف ہیں۔مگر سوال یہ نہیں ہے کہ خوشی کیا ہے اگر آپ کے پاس زر ہے تو آپ کے پاس وقت ہے۔میرا تو ایسا ماننا ہے۔وقت خریدہ جاسکتا ہے۔ہر شے کی ایک قیمت ہے۔امیر ہونا یا امیر بن جانا آپ کو وقت اور خوشی دونوں مہیا کردیتا ہے اگر آپ حق دار ہیں تو۔اس نے مرساں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جب

میں پچیس سال کا تھا جب ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر ایک شخص جو بہ ہوش حواس ہو اور خوشی کا متلاشی ہو اسے امیر ہونے کا حق حاصل ہے۔خوشی حاصل کرنے کی بھوک اور لگن کسی کے دل میں پیدا ہونے والا سب سے معتبر اور اعلیٰ جذبہ ہے۔میری نظروں میں یہ جذبہ ہر شے کا حقدار بنا دیتا ہے۔بس سچی لگن ہونی چاہئے۔مرساں کو متواتر دیکھتے ہوئے اب زیگریو نے قدرے آہستگی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ مرساں میری بات توجہ سے سنو۔پچیس سال کی عمر میں، میں نے اپنی خوش بختی بنانی شروع کی۔اصول اور قانون کی پرواہ کئے بغیر میں اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا گیا۔اور چند ہی سالوں میں، میں نے سب کچھ حاصل کرلیا۔تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔میں نے تقریباً بیس لاکھ سے زیادہ کمایا۔اب دنیا میں میرے لئے سب کچھ تھا۔میں وہ زندگی گزار سکتا تھا جس کے میں خواب دیکھا کرتا تھا۔زیگریو نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر بہت آہستہ سے بولا۔میں یقیناً وہ زندگی گزارتا اگر ایک حادثہ میں میری ٹانگیں نہ چلی جاتیں۔مگر میں زندہ رہا اور اب اس حالت میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔تم سمجھ رہے ہو تمہیں یقیناً سمجھنا چاہئے کہ میں اس کسمپرسی کی حالت میں زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔پچھلے بیس سالوں سے میری کمائی ہوئی دولت یہاں میرے ساتھ بیکار پڑی ہے۔میں نے عام سی زندگی گزاری ہے۔میرا سارا سرمایہ ویسے ہی موجود ہے۔زیگریو نے لاچاری کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھک لیں اور بہت سرد لہجہ میں بولا۔زندگی کسی مجبور ولاچار شخص کی محبت سے داغ دار نہیں ہونی چاہئے۔

اس موقع پر اس نے آتش دان کے قریب رکھے ہوئے ایک میز کی دراز کو کھولا اور اس کے اندر رکھی ایک آہنی چھوٹی تجوری اس نے مرساں کو دکھائی۔اس کے تالے کی چابی سوراخ میں لگی ہوئی تھی۔تجوری کے اوپری حصہ پر ایک سفید لفافہ رکھا ہوا تھا اور ایک بڑا کالا پستول اس کے اوپر۔زیگریو نے مرساں کے حیران کن چہرہ اور پر تجسس نگاہوں کا جواب اپنے مسکراتے چہرے سے دیا۔سیدھی سی بات تھی جب ناگہانی حادثہ نے اسے ٹانگوں سے محروم کردیا تھا اور زندگی اس کے لئے عذاب بن گئی تھی تو اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ خط لکھا جس میں اس نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کی وجوہات کو تفصیل سے لکھا تھا اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا۔خط پر اس نے تاریخ نہیں ڈالی تھی۔اس نے بھرے پستول کو میز پر رکھا پھر جھک کر اپنا ماتھا اس پر ٹیک دیا۔پھر اپنے گالوں کو اس پر رگڑتا رہا اپنے رخسار کی گرمی سے پستول کی ٹھنڈی نالی کو گرم کرتا رہا۔بڑی دیر

تک وہ اسی حرکت میں مصروف رہا۔کبھی اپنی انگلی پستول کی لبلبی سے مس کرتا رہا۔کبھی حفاظتی گھنڈی کو بھی حرکت دیتا رہا۔حتیٰ کہ اس کے گرد ایک گہری خاموشی چھا گئی اور اس پر ایک نیم مدہوشی طاری ہوگئی۔اس نے موت کی ٹھنڈک کو پستول کی نالی میں محسوس کیا پھر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کے لئے شاید اب یہی بہتر ہوگا۔کہ وہ خودکشی کے اقرار نامے پر تاریخ ڈال کر پستول کی لبلبی دبا دے۔مگر ساتھ ہی موت کی بھیانک حقیقت بھی اس کے ذہن میں عیاں تھی کہ زندگی کے خاتمے کا کیا مطلب ہے۔پھر اچانک زندہ رہنے کی مخفی خواہش عود کر باہر آ گئی۔منہ میں پیدا ہونے والی کڑواہٹ کو اس نے نگلا اور سوچا۔بے شک میری زندگی برباد ہوگئی ہے۔اور میں اس زمانے میں صحیح سوچ رہا تھا کہ اس دنیا میں خوش حاصل کرنا بہت مشکل جہاں ہر طرف تشدد اور بے عقلی کا دور دورا ہو پھر زیگریو ہنسا اور کہا دیکھو مرساں اس نام نہاد تہذیبی دنیا کی تمام مجبوریاں اور ظلم و ستم اور دکھ کا پیمانہ اس بے وقوفی کی سوچ پر ہے کہ خوش حالی کا ماضی کے کسی روایت سے کوئی تعلق ہے۔خوش باش اقوام تاریخ کو نہیں روتے۔لوگ ماضی کے مزار پر ماتم نہیں کرتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مرساں کو وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔جب سے زیگریو نے اپنی کہانی اپنے فلسفیانہ سوچ کا اظہار کیا تھا مرساں نے اب پہلی مرتبہ نظر بھر کر دیکھا اور کہا۔میں سمجھتا ہوں تم صحیح سوچتے ہو۔اپنی لمبی تقریر کے بعد معذور زیگریو کی سانس نہیں سما رہی تھی۔کچھ توقف کے بعد آخر وہ بولا۔میں یقین کرنا چاہ رہا تھا۔تم غلط نہ سمجھنا۔میں صرف یہ نہیں کہنا چاہتا کہ دولت ہی خوشی خرید سکتی ہے۔میرا مطلب صرف یہ ہے کہ کچھ طبقہ کے لئے خوشی ممکن ہے بشرطیکہ ان کے پاس وقت بھی ہو۔امیر اور دولت مند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پیسے کی طرف سے بے فکری۔

یہ کہہ کر وہ اپنے گرد کمبل لپیٹ کر کرسی میں دھنس گیا۔رات نے پوری طرح بسیرا کر لیا تھا۔ہر سو اندھیرا چھا چکا تھا۔مرساں زیگریو کو دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ایک لمبی خاموشی کے بعد مرساں نے زیگریو سے دوبارہ بات کرنی چاہی۔اس اندیشے کو دور کرنے کے لئے کہ وہ ابھی موجود ہے۔اس نے کہا تم نے اپنے طور پر ایک بظاہر ایک خوش کن خطرہ مول لیا تھا۔ہاں۔زیگریو نے سرگوشی میں کہا ہاں یہ بہتر ہے کہ انسان اس دنیاوی زندگی میں شرط لگا لے نہ کہ اگلی زندگی کا سوچے۔مگر میرے لئے یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔زندگی کے ابتدائی بیس سالوں تک تو میں کتنے مخصوص خوشیوں کے تجربہ سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔زندگی مجھے نگل گئی۔میں زندگی کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا اور جو

چیز مجھے موت سے ڈراتی ہے وہ یہ ہے کہ موت میرے احساسِ محرومی کو مکمل کر دے گی۔مگر مجھ میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔آس قائم ہے۔مرساں اس کے قریب آیا۔سوچو اس کے بارے میں سوچو مرساں زیگریو نے حیرت و یاس کے لہجہ میں کہا۔گویا مرساں سے التجا کر رہا ہو۔مرساں نے جواب میں صرف یہ پوچھا ’’کیا میں روشنی کر سکتا ہوں۔‘‘ضرور زیگریو نے بھی مختصراً کہا۔ اچانک روشنی ہونے پر زیگریو کا چہرہ بالکل زرد دکھائی دے رہا تھا۔وہ ابھی بھی زور زور سے سانس لے رہا تھا۔مرساں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو زیگریو نے نفی میں سر ہلایا۔مجھ پر ترس نہ کھاؤ۔مجھے اچھا نہیں لگتا جب لوگوں کے چہرے پر ہمدردی کے آثار پیدا ہوتے ہیں میری لنگڑی ٹانگوں کو دیکھ کر۔مرساں نے سوچا زیگریو اس سے باتیں بنا رہا ہے۔کسی چیز کو بھی سنجیدگی سے نہ لو سوائے خوشی کے۔اس کے بارے میں سوچو مرساں اپنے سچے دل سے سوچو۔زیگریو نے مرساں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔شکر ادا کرو تمہاری دونوں ٹانگیں موجود ہیں۔اچھا اب تم جاؤ۔مجھے نیند آ رہی ہے۔

باب چہارم

اس اتوار کی شب جب وہ گھر واپس آ رہا تھا تو مرساں زیگریو کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ مگر جب وہ اوپر اپنے فلیٹ پر پہنچا تو اسے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ اسلحہ ساز کارڈونا کے فلیٹ سے آ رہی تھی۔ اس نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کراہنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ دروازے میں کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ اسلحہ ساز اپنے بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ایک بچے کی طرح سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے پاؤں کی طرف ایک بوڑھی عورت کی تصویر تھی۔ یہ مر چکی ہے کارڈونا نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ یہ سچ تھا مگر یہ تو بہت پہلے کی بات ہے۔

کارڈونا بہرہ تھا اور آدھا گونگا۔ وہ ایک تیز وطرار اور کمینہ شخص تھا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک وہ اپنی بہن کے پاس رہتا تھا۔ مگر اس کے جبر نے آخر کار اس کی بہن کو تھکا دیا اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہنے لگی اس کو الگ کر کے۔ وہ اکیلا رہ گیا۔ بے بس اور لاچار ایک ایسے شخص کی طرح جسے خود ہی کھانا پکانا ہو اور گھر کی صفائی کرنی ہو زندگی میں پہلی مرتبہ۔ اس کی بہن نے مرساں کو اس کی لڑائی کے بارے میں بتا رکھا تھا۔

کارڈونا کی عمر تقریباً تیس سال کی رہی ہوگی۔ چھوٹے قد کا مگر اچھے خدوخال کا۔ بچپن سے وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا ماں ہی وہ شخصیت تھی کہ جس سے وہ کبھی ڈرا ہو۔ ماں بھی وہمی زیادہ تھی حقیقت پسند کم۔ اس کو اپنی ماں سے اس کی تمام زیادتیوں کے باوجود محبت تھی اور اپنی محبت کا ثبوت وہ اس کو تنگ کر کے دیتا تھا یا پھر چرچ اور پادری کو برا بھلا کہہ کر۔ اگر وہ اپنی ماں کے ساتھ اتنے عرصہ رہا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کسی اور عزیز عورت کے دل میں اپنی محبت نہیں پیدا کی تھی کہ جو اس کا خیال رکھتی۔ جوان ہونے پر وہ کبھی کبھی بدقماش عورتوں پر اپنے مرد ہونے کا ثبوت دیتا تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد وہ اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگا۔ مرساں نے وہ کمرہ ان کو کرائے پر دیا ہوا تھا۔ ہر ایک اپنی جگہ تنہا پسند وہ اپنی لمبی بیکار اور بیہودہ زندگی سے برسر پیکار تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کئی کئی دن گزر جاتے اور آپس میں نہیں بولتے تھے۔ اور اب اس کی بہن اس کو چھوڑ کر الگ ہو گئی تھی۔ وہ اتنا مغرور تھا کہ کوئی شکایت کرتا یا اپنی بہن کو واپس آنے کے لئے کہتا۔ وہ اکیلا رہنے لگا۔ ہر صبح وہ نیچے کے ہوٹل میں ناشتہ کرتا اور رات کا کھانا وہ ہوٹل سے لا کر اوپر اپنے کمرے میں کھاتا۔ اپنے کپڑے خود دھوتا تھا مگر کمرے کی صفائی کبھی نہیں کرتا تھا۔ بہن کے جانے کے بعد وہ کبھی کبھی کسی اتوار کو مجبوراً کچھ جھاڑ پونچھ کر لیتا تھا۔ مگر اس کی گندی فطرت اور پھوہڑ اور بھونڈے پن کی وجہ سے پورا کمرہ بے ترتیب اور بکھرا پڑا رہتا تھا۔ جو چیز جہاں پڑی ہے ہفتوں پڑی ہے۔ گندے کپڑے کونے کھدروں میں گھسیڑ دیتا تھا۔ آخر وہ تھک ہار کر اتنا لاپرواہ ہو گیا کہ عرصہ سے اس نے اپنے بستر کو بھی ہاتھ نہیں لگایا اور کبھی کبھی اپنے کتے کے ساتھ اس کے کمبل پر لیٹ جاتا اس کی بہن نے مرساں کو بتایا کہ وہ کبھی کبھی کیفے میں بیٹھ کر روتا رہتا ہے۔ یا پھر لانڈری میں اپنے کپڑے مجبوراً دھوتے ہوئے بڑبڑاتا رہتا ہے۔ روتا رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جیسی اس کی سخت زندگی تھی کہ وہ کبھی کبھی اپنے تنہائی کے عذاب سے چیخ اٹھتا تھا۔ اس کی بہن صرف اس پر رحم کھا کر اس کے ساتھ رہی تھی۔

کارڈونا کا اپنی بہن کا اس شخص سے ملنا جلنا بالکل پسند نہیں تھا کہ جس کو وہ پسند کرتی تھی۔ محبت کرتی تھی۔ اس عمر میں نادانی تھی وہ بندہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ وہ اس کے لئے لوگوں کے باغیچہ سے توڑے ہوئے پھول لاتا تھا۔ کبھی کبھی پھل اور مشروب کی چھوٹی بوتلیں۔ وہ ایک دوسرے کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ بندہ اپنے گلے میں رومال باندھے رکھتا تھا۔ وہ اس کے رومال کو دھو کر خوشبو لگاتی مگر اس کا بھائی کارڈونا اس کو کبھی اپنے گھر میں نہیں آنے دیتا۔ وہ خفیہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایک روز جب کارڈونا گھر پر نہیں تھا وہ اپنے محبوب کو گھر کے اندر لے آئی۔ کارڈونا آ گیا اور وہ پکڑے گئے۔ ایک زبردست ہنگامہ ہوا۔ دنگا فساد۔ اس کے گلے کا رومال کھل کر وہیں کہیں کمرے میں گر گیا۔ اس کے بعد اس کی بہن اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔

کبھی کبھی لوگ اس تنہا اسلحہ ساز پر ترس کھانے لگتے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ مرساں سے اپنی

شادی ہونے کے امکان کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ عورت اس سے عمر میں بڑی تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں تھی کہ کارڈونا اس کا خیال رکھے گا۔ مگر یہ سب کچھ شادی سے پہلے کے خیالات تھے۔ کارڈونا نے بعد میں شادی سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ وہ عمر میں اس سے کافی بڑی ہے۔ وہ پھر اس کمرے میں تنہا رہ گیا۔ آہستہ آہستہ نجاست نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ قید کر لیا۔ بستر سے لگا دیا۔ اس کی رہائش واقعی بہت گندی تھی۔ اسے خود بھی اب اپنی جگہ سے نفرت ہو گئی تھی۔ ایسی صورت میں اسے سکون صرف ہوٹل اور کیفے میں ملتا تھا۔

اس کے آس پاس کے کیفے خاص طور پر بہت پر رونق تھے۔ وہاں اس کو وہ گرم جوشی ملتی تھی جو ایک مجبور تنہا شخص کو پناہ میسر کرتی تھی۔ مرساں اس کو تقریباً ہر رات ملتا۔ ویسے کارڈونا کوشش کرتا تھا کہ جتنی دیر سے وہ کیفے سے واپس آ سکے اتنا ہی اس کے لئے بہتر ہوتا۔ مگر آج رات اسے کیفے میں بھی سکون نہ ملا اور وہ جلد گھر واپس آیا اسے اپنی بوڑھی ماں کی تصویر کا خیال راستے میں آیا۔ وہ دوبارہ اس وقت میں پہنچ گیا جب وہ اپنی ماں کو پیار کرتا تھا تنگ کرتا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ اپنے ماضی میں کھو گیا جب وہ شاید خوش تھا۔ وہ اپنے گزرے ہوئے کل کو آج سے مقابلہ کر رہا تھا تو اسے اپنے دل و دماغ میں ایک روحانی چمک محسوس ہوئی اور اس نے گریہ گیری شروع کر دی۔ اب جب بھی وہ اپنی وحشیانہ زندگی کو تسلی دیتا تھا تو مرساں اس کی تسلی اور تشفی کے لئے اس کے پاس آ جاتا تھا۔

آج وہ اس کے غلیظ کمبل پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھا۔ کارڈونا کے سامنے رکھی ہوئی میز پر ایک مٹی کے تیل کا لیمپ اور ایک وائن کی بوتل۔ کچھ روٹی کے ٹکڑے ایک چھوٹا ٹکڑا پنیر کا رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس کے اوزار کا بکس بھی تھا۔ کمرے کی چھت کے چاروں کونے مکڑی کے جالوں سے گھرے ہوئے تھے۔ کمرے کی کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ صرف ایک کھڑکی تھوڑی سی کھلی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی۔ روشنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اسی دوران کارڈونا نے اپنی ماں کی تصویر کو اٹھایا اور چومنے لگا۔ میری پیاری بے چاری غریب ماما۔ مگر اس طرح دراصل وہ اپنے آپ پر ترس کھا رہا تھا۔ وہ اور مرساں جانتے تھے کہ وہ بے چاری تو اب منوں مٹی کے نیچے شہر کے دوسری جانب قبرستان میں دفن ہو چکی ہے۔ مرساں اب رخصت ہونا چاہتا تھا۔ اس نے آہستہ سے سمجھانے کے انداز میں کارڈونا کو کہا کہ تم آرام سے اسی طرح لیٹے رہو۔ میرے پاس کوئی کام بھی نہیں ہے۔ کارڈونا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور ماں کی تصویر کو دیکھ کر کہا میں اس سے محبت کرتا

تھا۔ بہت محبت کرتا تھا۔ اب یہ مر چکی ہے۔ میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ مرساں نے اس کے کندھے پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور وہ گندے غلیظ تکیے میں دھنس گیا۔ پلنگ کے نیچے سے کتے کے کراہنے کی آواز اور اس کے گندے جسم کی نفرت انگیز بو آئی۔ کتے نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر بستر کے نیچے سے نکالا اور مرساں کی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس گھٹے ہوئے کمرہ میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ مرساں نے کارڈونا کو ایک سگریٹ پیش کی۔ دونوں خاموشی سے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ رات کے آخری ٹرام گزری۔ کارڈونا گہری نیند سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ رنج اور غم کے آنسوؤں سے اس کے نتھنے بند ہو رہے تھے۔ کتا مرساں کے پاؤں تلے پسر گیا تھا۔ اور کبھی کبھی نیند میں غراتا تھا۔ لیمپ کی روشنی جھلملا رہی تھی پھر ایک پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ لیمپ بجھ گیا۔ انجلے تیل کی بو پھیل گئی۔ مرساں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظریں میز پر رکھے وائن کی بوتل پر تھیں۔ ایک کوشش کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کے پاس گیا اور وہاں کھڑا ہو گیا۔ رات کی پراسرار خاموشی اس پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ سمجھا ساحل سمندر پر کسی جہاز پر کوئی زوردار دھماکہ ہوا مگر وہ اس کے بھوپو کی آواز تھی کہ نیا دن طلوع ہونے والا ہے لوگوں اپنے اپنے کام پر آؤ۔ دوسری صبح مرساں نے زگیریو کو مار ڈالا۔ گھر واپس آیا اور پوری دوپہر سوتا رہا۔ جب وہ اٹھا تو اسے بخار ہو رہا تھا۔ شام تک وہ بستر میں ہی پڑا رہا۔ پھر قریبی ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ اسے فلو ہو گیا ہے۔ اس کے دفتر سے ایک شخص آیا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مرساں نے اپنے آفسر موسیو لنگالوس کو کن وجوہات کی بنا پر اپنا استعفیٰ پیش کیا ہے۔ چند دنوں کے بعد ہر معاملہ طے پا گیا۔

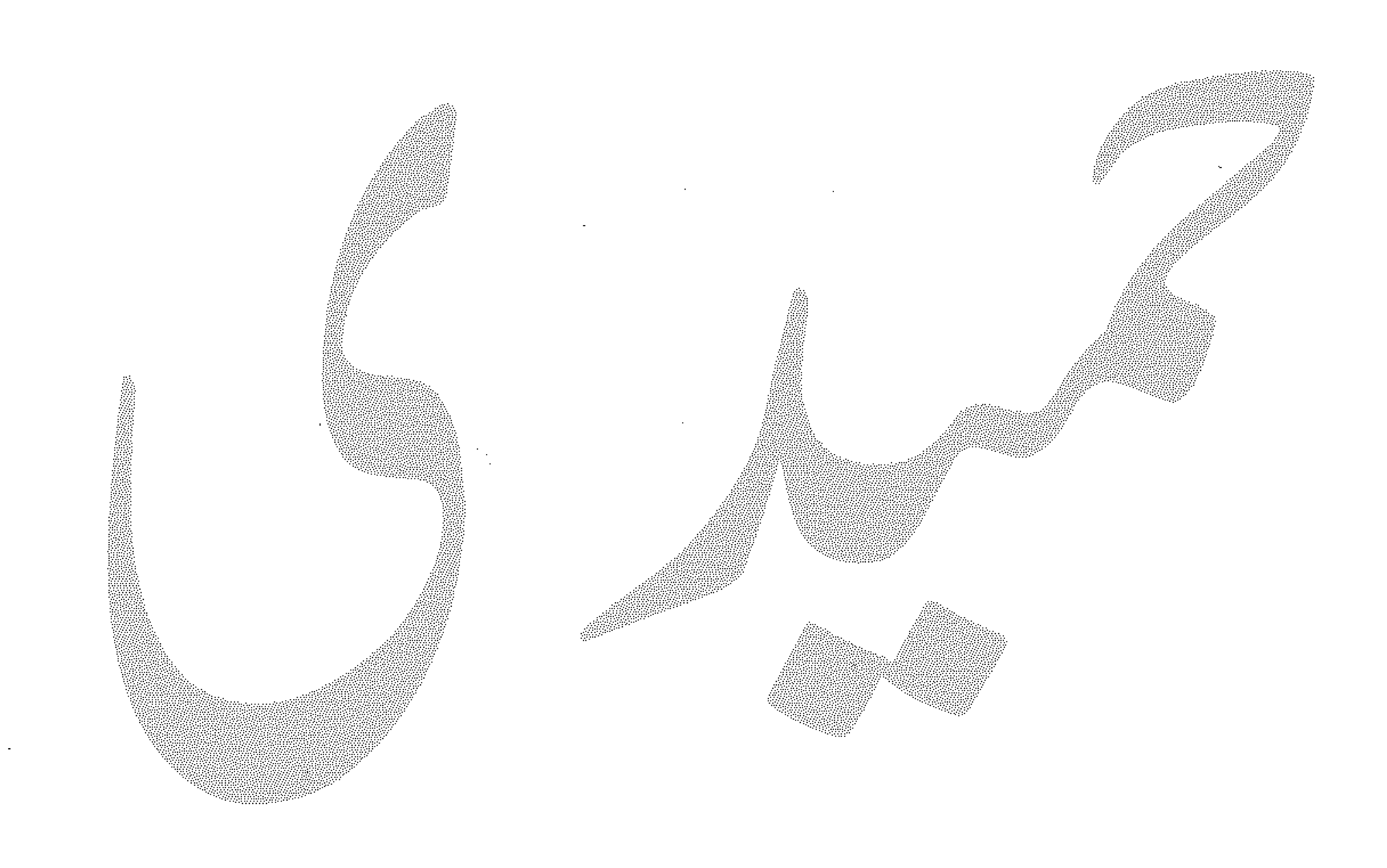
اخبار میں ایک خبر ایک رپورٹ چھپی۔ تحقیقات نے زگیریو کی موت کو خودکشی قرار دے دیا تھا۔

مارتھا مرساں سے ملنے آئی اور سرد آہ بھر کر افسوس کا اظہار یوں کیا۔ کبھی وہ وقت بھی تھا کہ تم اس کی جگہ لینا چاہتے تھے۔ مگر کبھی زندہ رہنے کے لئے زیادہ ہمت کی ضرورت ہے اپنے آپ کو گولی مار لینے کے مقابلے میں۔

اگلے ہفتہ مرساں پانی کے جہاز پر مارسیلز جا رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے فرانس جا رہا ہے آرام کرنے کے لئے۔ مارتھا کو لیون سے مرساں کا ایک خط ملا

خدا حافظ کہنے کے لئے جس نے مارتھا کے دل کو مجروح کیا۔ اسی خط میں مرساں نے ذکر کیا تھا کہ اُسے وسطی یورپ میں کوئی بڑی نوکری مل رہی ہے۔ مارتھا نے جواب میں اپنی تنہائی کا ذکر کیا تھا۔ مگر وہ خط مرساں کو کبھی نہ ملا۔ لیون پہنچ کر مرساں کو پھر تیز بخار ہو گیا۔ وہ بد دل ہو کر پہلی ٹرین سے پراگ چلا گیا۔

اسے بعد میں مارتھا سے خبر ملی کہ کئی دنوں تک زیگریو کی لاش مردہ خانے کے سرد خانے میں رہنے کے بعد بلا آخر اسے دفنا دیا گیا۔



باب پنجم

مجھے ایک کمرہ کرایہ پر چاہئے۔ اس نے جرمن زبان میں کہا کلرک کے ڈیسک کے پیچھے چابیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ کلرک نے غور سے اس شخص کو دیکھا جو ابھی آیا تھا۔ وہ بھورے رنگ کی برساتی پہنے ہوئے تھا۔ اور اپنی گردن دوطری طرف موڑے ہوئے تھا۔ ضرور جناب کیا ایک رات کے لئے چاہئے۔ نہیں مجھے نہیں معلوم میں کب تک ٹھہروں گا۔ ہمارے پاس تین کرایوں کے کمرے ہیں۔ اٹھارہ، پچیس اور تیس کراؤن والے۔ آپ کو کون سا چاہئے۔ مرساں اس وقت بے توجہی سے کھڑکی کے شیشے سے باہر پراگ کی اسٹریٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پتلون کی جیب میں تھے۔ آپ کون سا کمرہ پسند کریں گے۔ سر۔ کوئی سا بھی۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کلرک نے ایک چابی ریک سے نکالی اور مرساں کو دے دی۔ کمرہ نمبر 12 سر۔ مرساں اب چونکا۔ کتنا کرایہ ہے اس کا۔ 30 کراؤن جناب۔ ارے یہ تو بہت زیادہ ہے۔ مجھے 18 کراؤن والا کوئی کمرہ دے دو۔ بغیر کچھ بولے ہوئے اس کلرک نے ایک دوسری چابی اس کو دے دی اور اس کے ساتھ لٹکتے ہوئے نمبر پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ کمرہ نمبر 34۔ سر۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر مرساں نے اپنا کوٹ اتارا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور قمیض کی آستین اوپر کو موڑ لیں۔ وہ سنک پر لگے ہوئے آئینہ کی جانب گیا۔ اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ قدرے سانولا، سرخی مائل، سانولا ہو رہا تھا۔ کئی دنوں کی داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور ماتھے اور کنپٹی پر لٹک رہے تھے۔ اسے آئینہ میں اپنا خدوخال اچھا نہیں لگا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کے وقتی آرام و قیام کے لئے بس بہت تھا۔ اس سے زیادہ کی اس کو اس کرایہ میں توقع بھی نہیں تھی۔ باقی سامان کو درگزر کرتے ہوئے اس نے بستر پر بچھی چادر کو دیکھا جو بہر حال صاف ستھری تھی۔ اس نے اپنے شیو کا سامان واش بیسن کے ریک پر رکھا۔ ہاتھ دھونے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ پردے سرکائے۔ یہ ہوٹل کا پچھلا حصہ تھا۔ نیچے ایک احاطہ تھا جس

کے اطراف میں گھروں کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔احاطہ میں رسیاں بندھی ہوئی تھیں جن پر کپڑے سوکھنے کے لئے لٹکے ہوئے تھے۔کھڑکی سے ہٹ کر وہ بستر پر لیٹ گیا اور فوراً اس پر گہری نیند طاری ہوگئی۔اچانک اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے میں شرابور تھا۔وہ کمرے میں ادھر ادھر بے مقصد چکر کاٹنے لگا۔ایک سگریٹ سلگا کر وہ بستر پر بیٹھ گیا۔اس کے منہ کا مزہ بدمزہ ہو رہا تھا سونے کی وجہ سے اور سگریٹ پینے سے۔پھر بھی وہ اپنی اس تنہائی اور اکیلے پن کی اداسی سے ایک عجیب طرح سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ہر معاملے سے دوری پر وہ اپنے بخار کو بھی بھول گیا تھا۔شک وشبہ،شرم،پچھتاوہ جیسے خیالات سے وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔وقت اس کے لئے کسی تالاب میں رکے ہوئے پانی کی طرح تھا۔وقت ٹھہر گیا تھا۔کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔اس نے دروازہ کھولا تو ایک چھوٹے قد اور سرخ بالوں والا شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔مرساں کے دوسوٹ کیس اپنے ہاتھوں میں پکڑے وہ جھکا ہوا تھا۔وہ سخت چڑچڑے موڈ میں تھا۔غم اور غصے میں اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔مرساں کو اپنے بڑے سوٹ کیس کا ٹوٹا ہینڈل یاد تھا جس کی وجہ سے یقیناً اس کو اٹھانے میں اس حامل کو مشکل ہوتی ہوگی۔وہ اس بوڑھے حامل کو تسلی دینا چاہتا تھا مگر اس کے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔اس سے پہلے وہ بول پڑا۔اس کے 14 کراؤن ہوئے۔اتنا زیادہ کرایہ۔خیر یہ لو۔مرساں نے رقم ادا کردی۔کچھ توقف کے بعد مرساں نے سوچا کہ اس کمرے کی گھٹن سے نکل کر باہر جانا زیادہ اچھا رہے گا۔اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے ایک سگریٹ سلگایا اور باہر نکل گیا۔ہوٹل سے باہر وہ جس اسٹریٹ پر آیا اس کے اطراف چھوٹے بڑے ہوٹل،ریسٹورنٹ اور کیفے تھے۔ایک پتلی سڑک پار کر کے جب دوسری جانب شاہراہ پر آیا تو اسے پراگ شہر کا ٹاؤن ہال دکھائی دیا۔شام کے ڈھلنے میں ٹاؤن ہال کی بلڈنگ اور ساتھ ہی پراگ کے پرانے چرچ کی عمارت پرسکون لگ رہی تھی۔اچھے خاصے لوگ اس وقت وہاں موجود تھے۔کچھ کام سے واپس ہو رہے تھے۔کچھ شام کو تفریح اور مٹرگشت کے لئے نکلے ہوئے تھے۔جب بھی کوئی عورت اس کے پاس سے گزرتی وہ اس کو نظر بھر کر دیکھتا اور دل ہی دل میں گنگناتا۔ابھی تو میں جوان ہوں،ابھی تو میں جوان ہوں۔پھر یہ بھی سوچتا کہ ایک صحت مند دل اور دماغ والے شخص کو ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔اس وقت وہ اپنے بغیر شیوہ کے چہرے اور بکھرے بال اور غیر استری شدہ کپڑوں میں اپنے آپ کو عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔اس کے اندر وہ خود اعتمادی پیدا نہیں ہو رہی تھی جو وہ ایک اچھے سوٹ بوٹ میں ملبوس ہو کر محسوس کر سکتا تھا۔سورج

ڈوبنے پر تھا مگر اس کی ترچھی روشنی اب بھی گنبد والی بلڈنگ پر چمک پیدا کر رہی تھی۔وہ بغیر کسی شعوری خیال کے چرچ کے اندر چلا گیا اور ایک عبادت کرنے والی بنچ پر بیٹھ گیا۔چرچ میں ایک مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔برسا برس پرانی چرچ کی خوشبو تقدس سے بھری ہوئی تھی۔چرچ کی اندرونی دیواروں پر مقدس فرشتوں۔بی بی مریم اور یسوع مسیح کی شبیہہ اور مجسمے ایک پر اسرار ماحول پیدا کر رہے تھے۔ہر سو سکون ہی سکون تھا۔اتنی خاموشی کہ دل دھڑکنے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔وہ اس سحر انگیز فضا سے گھبرا کر باہر آگیا۔چرچ کے صدر دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس کھلی فضا میں تازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لیں۔دور کھلے آسمان پر ایک تارہ چمک رہا تھا۔سڑک پر چلتے ہوئے وہ کسی سستے ہوٹل کی تلاش میں تھا وہ تنگ اور قدرے اندھیر گلیوں میں آگیا۔گو یا دن میں بارش نہیں ہوئی تھی پھر بھی گلیاں گیلی تھیں،سیلن تھی۔اتنے میں ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوگئی۔شاید اب وہ کسی اور کھلے بازار کی طرف جا رہا تھا کیونکہ اسے کسی اخبار بیچنے والے لڑکے کی آواز آئی۔لے لو اخبار ''نارودینی پولیٹکا'' اچانک اسے ایک تیز چبھنے والی بو آئی۔اس بو سے اس کے حواسِ خمسہ بیدار ہوگئے۔وہ کچھ آگے گیا تو اسے بو یا خوشبو کی وجہ معلوم ہوئی۔ایک کونے میں ایک بڑھیا تیز سرکے میں ڈوبے ہوئے کھیرے بیچ رہی تھی۔ایک شخص نے ایک کھیرا خریدا جو بڑھیا نے کاغذ میں لپیٹ کر اسے دیا۔وہ مرساں کے قریب ہی آکر کھڑا ہو گیا اور جوں ہی اس نے کھیرے کو دانتوں سے کاٹا ایک تیز بو کا بھبکا مرساں کے نتھنوں میں گھسا۔اسے متلی محسوس ہوئی۔وہ اپنی ناک انگلی سے دبا کر ایک قریبی ریسٹورنٹ کے اندر چلا گیا۔ریسٹورنٹ میں ایک موسیقار ایکارڈین بجا رہا تھا۔یہ ایک ہال تھا۔مدھم سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے۔کوئی صرف چیکوسلوکیہ کا مشہور سبزی جھاگ دار بیر پی رہا تھا۔کچھ من چلے کچھ کھائے پیے بغیر صرف سگریٹ کے دھویں اڑا رہے تھے۔وہ ایک ایسی میز پر جا بیٹھا جس پر صرف ایک اکیلا آدمی بیٹھا تھا۔لمبا دبلا پتلا وہ بے فکری سے کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا سگریٹ منہ میں لگائے ہونٹوں سے ادھر ادھر گھوما رہا تھا۔اس نے مرساں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔مرساں نے بھی اسے کن آنکھیوں سے دیکھا۔اس کے کاج میں ایک سرخ ستارہ لگا ہوا تھا۔

مرساں اپنے آرڈر دیے ہوئے کھانے سے بہت تھوڑا اور بہت عجلت میں کھایا۔ایکارڈین کی دھن اب بلند آواز سے بج رہی تھی۔ایک عجیب بات اس نے محسوس کی کہ موسیقار کی نگاہیں برابر اس کے چہرہ پر لگی تھیں۔وہ انجانے تفکر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا کہ ہوٹل سے باہر چلا جائے۔جب وہ

موسیقار کے قریب سے ہو کر گزرا تو اس نے جانا کہ ایکارڈین بجانے والا دراصل نابینا تھا۔ باہر رات نے شہر کو اپنی تاریکی میں لے لیا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ وہ علاقہ غالباً کسی دریا کے قریب تھا۔ ہوا کی نمی اور پانی کی آواز سے اسے ایسا محسوس ہوا۔ کچھ دور چل کر وہ آہنی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا جس کے ساتھ دور تک چہار دیواری چلی گئی تھی۔ جس پر قدیم نقش و نگار کندہ تھے۔ اسے پتا چلا کہ وہ شہر کے اس علاقہ میں آ گیا ہے۔ جہاں نادار لوگ بستے تھے۔ چہار دیواری کے احاطہ میں یہودیوں کا پرانا قبرستان تھا۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے گھبراہٹ کا احساس ہوا اور وہ وہاں سے تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ حتیٰ کہ وہ بغیر رکے ادھر ادھر سے ہوتا ہوا اپنے ہوٹل تک پہنچ گیا۔ اسے الٹی سی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے تیسے وہ اپنے کمرہ میں پہنچ کر بستر پر گر پڑا۔ اس پر گہری نیند طاری ہو گئی۔

دوسری صبح اس کی اخبار بیچنے والے کی آواز سے آنکھ کھلی۔ آسمان پر اب بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر کبھی کبھی بادلوں کے پیچھے سے سورج بھی جھانکنے لگتا تھا۔ حالانکہ مرساں کو کمزوری تھی مگر اب وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سامنے آج کا پورا دن پڑا تھا۔ اس طرح کی خاموش اور تنہا زندگی وہ کب تک گزارے گا۔ اس کو ہر لمحہ اب ایک عرصہ لگ رہا تھا۔ وہ کل کی طرح بلا مقصد ادھر ادھر گشت نہیں کرے گا۔ اب وہ ایک طریقہ سے ایک ہفتہ اس شہر میں گزارے گا۔ وہ آرام اور سکون کے ساتھ میز کرسی پر بیٹھ گیا اور پورے ہفتہ کا پروگرام ترتیب دینے لگا۔ شہر کے تمام چرچ، میوزیم، باغات، تفریحی مقامات، بازار، ہوٹل، ریسٹورنٹ، شہر کا جدید اور پرانا حصہ غرض کہ پراگ شہر کا بھرپور جائزہ لے گا۔ گھومے گا۔ مزے لے گا۔ کچھ نہیں چھوڑے گا۔ وہ نئے عزم اور پروگرام کے ساتھ ہوٹل سے باہر آیا۔ ایک کونے میں وہی نابینا ایکارڈین بجانے والا شخص گردن جھکائے آلہ موسیقی بجانے میں مگن تھا۔ اگلے موڑ پر اسے پھر وہی چبھنے والی بو سرکہ اور کھیرے کی آئی۔ وہ وہاں سے جلدی سے گزر گیا۔ پھر روز وہ شہر کو مختلف انداز سے دیکھتا رہا۔ چیک تہذیب اور انداز زندگی کو اس کے بوقلمونی سے لطف اندوز ہوا۔ ہر روز کے بعد وہ دوسرے روز شہر چھوڑنے کو سوچتا رہا۔ اس طرح اس کو پراگ میں چوتھا دن تھا۔ وہ لب دریا گھومتا رہا۔ شہر کے ایک ویران علاقے میں اس نے ایک شخص کو ایک زخمی شخص جو بعد میں زخم کی تاب نہ لا کر مر چکا تھا کے گرد غم میں پاگلوں کی طرح ناچتے دیکھا۔ پراگ کی یکسانیت سے اب اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ اب وقت تھا کہ وہ یہاں سے رخصت ہو لے تو بہتر تھا۔

باب ششم

تیز رفتار ٹرین اسے شمال کی جانب لے جا رہی تھی۔ مرساں نے اپنا جائزہ لیا۔ وہ کمپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ آسمان پر منڈلاتے بادلوں کے ساتھ ساتھ ٹرین پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے اچانک آدھی رات کو پراگ سے اس ٹرین میں سفر کو سوچ لیا تھا۔ اب صبح ہونے کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ بوہیما کا میدانی علاقہ تیزی سے گزر چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہو جائے گی۔ دور بہت دور کارخانوں کی بلند چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مرساں کو ایسے ماحول میں نہ جانے کیوں رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ جو اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ان ہاتھوں کو جانتا تھا پہچانتا تھا۔ وہ اس کے اپنے ہاتھ تھے مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قابو میں نہ ہوں۔ ان ہاتھوں کی حرکت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس نے الٹے ہاتھ سے اپنا ماتھا ٹٹولا اسے بخار ہو رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اسے اپنی جیب سے سگریٹ نکالا۔ مگر دوبارہ رکھ لیا۔ اس کی طبیعت متلا رہی تھی۔

اس نے دو روز سفر کیا۔ مگر اب یہ سفر اس کے لئے راہ فرار نہیں تھا۔ سفر کی یکسانیت اس کو ایک طرح سے سکون پہنچا رہی تھی۔ یہ ٹرین جو اسے آدھا یورپ پار کرا چکی تھی اسے دو دنیا کے درمیان جھولا رہی تھی۔ یہ سفر اسے اپنے وطن سے دور لے گیا تھا۔ اور کسی نہ کسی ٹھکانے پر پہنچا دے گا۔ اس زندگی سے اسے دور لے جائے گا جسے وہ بھول جانا چاہتا ہے اور اب اس کی ایک ایسی نئی زندگی شروع ہو گئی جہاں خواہشات کی بادشاہت ہو گی۔ ایک لمحہ بھی بور ہونے کے لئے نہیں ہو گا۔ فی الحال وہ غیر معمولی طور پر ٹرین کے خالی ڈبہ کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ کوئی مخل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا سفر جان بوجھ کر برسلو تک بڑھا دیا تھا۔ صرف بارڈر پر اپنا ٹکٹ بدلنے کے لئے اسے اترنا پڑا تھا۔ وہ اپنی آزادی کے احساس کو برقرار رکھنے کے لئے اسی طرح اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا تھا۔ وہ آزاد تھا ساتھ ہی اب تھک بھی چکا تھا ہلنا جلنا مشکل ہو رہا

تھا۔مگراس نے اپنی امید کوقائم رکھا۔ٹرین میں سفر کرتے ہوئے یہ لمبی شب تنہائی اسے اچھی لگ رہی تھی۔جب ٹرین رات کی پراسرار خاموشی میں پہیوں پر ریل کی پٹریوں بھاگی جارہی ہوتی اور کبھی کبھی کسی چھوٹے اسٹیشن کو بغیر رکے پار کر جاتی۔ایسے میں صرف پلیٹ فارم پر لگی بڑی گھڑی کی چمک دکھائی دے جاتی تھی۔پھر کبھی کسی شہر کی روشنیوں کے درمیان کچھ دیر کے لئے رک جاتی یہ سمجھنے سے پہلے کہ یہ کون سی جگہ ہے ٹرین پھر اندھیروں میں داخل ہوجاتی روشنی اوراندھیرے کے اس جھلملاتے کھیل کے دوران ٹرین ڈرسڈن، بوٹزن، گورٹز،لگنڈ زکو پار کرگئی۔اب ایک طویل لمبی رات گزرنی تھی۔اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے اس کے پاس کافی وقت تھا۔آسمان پر گرجتے بادل اور چمکتی بجلی کبھی کبھی اس کے خیالات کومنتشر کردیتے تھے۔۔وہ پھر سے نئے سرے سے اپنی سوچ کواس راہ پر لاتا جہاں سے اس نے سوچنا شروع کیا تھا۔اپنے دل کو مضبوط کرتا اوراپنی کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے پرامید ہوجاتا پوری رات وہ اسی اُدھڑ بن میں رہا۔اپنی زندگی کے اچھے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی سوچ اس پر سوار رہی۔اچھی زندگی کے لئے وقت درکار ہے جیسے کوئی شاہکار بنانے میں مصور یا سنگ تراش کومحنت اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک چلتی ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کرخوشی کی تلاش ایسے ہی تھی جیسے کوئی قیدی قید خانے کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا اپنے بارے میں سوچ رہا ہو۔آزادی اور خوشی کے بارے میں پُرامید ہو۔

دوسرے دن کی صبح اس کی ٹرین ایک میدانی علاقے میں آہستہ ہوئی۔برسلو ابھی بھی بہت دور تھا۔یہ میدانی علاقہ بالکل بنجر اور خشک تھا۔دور دور تلک صرف دھول مٹی کوئی ہریالی یا درخت نہیں تھا۔مگر آسمان پر بادل اس میدانی علاقے کی پیاس بجھانے کے لئے بے چین تھے۔بڑے بڑے کالے پروں والے پرندے بارش کوخوش آمدید کہنے کے لئے غول درغول نچلی پرواز کررہے تھے۔کبھی کوئی اکیلا پرندہ غول سے الگ ہوجاتا تو فوراً ہی بے چین ہوکر پھر غول میں شامل ہوجاتا۔مرساں اپنی زندگی کا بھی ان پرندوں سے موازنہ کررہا تھا۔وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔کبھی سوچتا کہ وہ اس دھول مٹی میں شامل ہوکر زمین میں دفن ہوجائے اور مٹی میں مل کر مٹی ہوجائے۔اس کے لاشعور میں کبھی چرچ میں سنی ہوئی یہ بات موجود تھی کہ انسان مٹی سے بنا ہے۔مٹی میں واپس جائے گا اور پھر مٹی سے اٹھایا جائے گا۔وہ زندگی اور موت،غم اور خوشی،سکون اور پریشانی کے ان ہی نہ حل ہونے والے مسائل کی سوچ میں گم تھا۔اس نے اپنا ماتھا گاڑی کی کھڑکی کے بند

شیشے پر ٹیک دیا۔اس کے گرم سانسوں سے شیشہ دھندلا گیا۔باہر کا نظارہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔وہ پھر تخیل کی دنیا سے باہر آ گیا تھا۔چند گھنٹوں کی اور مسافت کے بعد وہ برسلو پہنچ چکا تھا۔

دور سے شہر کارخانوں کے دھواں نکلنے کی چمنیوں اور بلند و بالا چرچ کے اونچے میناروں کا جنگل محسوس ہورہا تھا۔

لمبی مسافت کے بعد وہ اسٹیشن سے باہر آیا۔کسی کاروباری مصروف شہر کی رونق ہر طرف تھی۔لوگ اپنے اپنے کاموں سے اِدھر اُدھر آ جارہے تھے۔مرساں نے پہلا وقت مزدوروں کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں گزارا۔وہاں ایک غریب لڑکا ہارمونیم بجارہا تھا۔روح کی تسکین کے ناکام کوشش میں۔مرساں نے دوبارہ جنوب کی طرف سفر جاری رکھنے کو سوچا۔دوسرے روز وہ ویانا میں تھا۔وہ آدھا دن اور پوری رات سوتا رہا۔جب وہ سوکر اٹھا تو بالکل ہشاش بشاش تھا۔اس کا بخار اتر چکا تھا۔ناشتے میں اس نے ابلے ہوئے انڈے اور گاڑھی کریم کھائی اس نے اپنا پیٹ اچھی طرح بھرلیا۔اور پھر اپنے بھاری پن کو دور کرنے کے لئے ٹہلنے نکل گیا۔ویانا کی صبح بڑی سہانی تھی کبھی دھوپ کبھی چھاؤں اور ہلکی بارش۔ویانا ایک تازہ دم کردینے والا شہر تھا۔میٹ اسٹیفن کا چرچ بہت بڑا تھا اور وہ تھک گیا۔وہ ایک کیفے میں جا بیٹھا۔شام کو وہ نہر کے کنارے بنے ہوئے ناچ گھر میں گھس گیا۔دوپہر اس نے بازار میں دوکانوں کے شوروم اور وہاں گھومتی ہوئی خوبصورت عورتوں کے درمیان گزاری۔وہاں کی عورتیں لبھانے والی تھیں جیسے وہاں کے باغات میں خوبصورت پھول،وہ بازار اور رہائشی علاقوں میں بلامقصد گھومتا رہا۔لوگ سست اور بے فکرے دکھائی دے رہے تھے۔نہ جانے کیوں اسی دوران اسے اپنے دوست روز اور کلیبر یاد آ گئے۔لیون چھوڑنے کے بعد اس نے پہلا خط لکھا۔یہ اس کا طویل خاموشی اور سوچ سے آزاد ہونے کا اظہار تھا۔اس نے لکھا۔

میرے پیارو۔میں یہ خط ویانا سے لکھ رہا ہوں۔مجھے نہیں معلوم تم لوگ آج کل کیا کررہے ہو۔میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں کہ آج کل میں زندگی گزارنے کے سفر کررہا ہوں۔میں نے اپنے بجھے دل کے ساتھ بڑی بڑی خوبصورت چیزیں دیکھی ہیں۔یہاں ویانا میں معصوم خوبصورتی کو نام نہاد ترقی اور تہذیب نے کھالیا ہے۔میں یہاں چرچ یا آثار قدیمہ نہیں دیکھ رہا بلکہ شترِ بے مہا کی طرح شہر میں گھومتا پھر رہا ہوں۔شام تھیٹر اور دل کو لبھانے والی جگہ کی تلاش میں۔اس سرگرداں میں روز و شب میرا وقت گزر رہا ہے۔آج صبح میں نے ناشتہ میں ابلے انڈے اور گاڑھی کریم سے اپنا پیٹ اچھی طرح بھرلیا تھا۔یہاں کی کریم کیا کہنے ہیں۔یہاں کے ہوٹل کے انتظام

کا کیا کہنا ہے۔مسافروں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔یہاں تفریح کے بہت ذرائع ہیں۔عورتیں بہت حسین وجمیل ہیں۔بس ایک چیز کی کمی ہے۔چمکتے سورج کی جو کبھی کبھی بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہے۔تم لوگ کیا کر رہے ہو آج کل۔اپنے بارے میں بتاؤ۔وہاں موسم کیسا ہے مجھ بے منزل مسافر کو بتاؤ۔جس کا کوئی در مقام نہیں اور جو ہمیشہ سے تمہارا وفادار ہے۔پیٹرس مرساں۔

خط لکھنے کے بعد وہ شام ناچ گھر میں گیا۔اس نے ہیلن کے ساتھ شام گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔وہ وہاں کی ایک ڈانسر تھی جو تھوڑی بہت فرانسیسی جانتی تھی اور اس کے ٹوٹے پھوٹے جرمن زبان کو بھی کسی حد تک سمجھ لیتی تھی۔رات دو بجے ناچ گھر سے نکل کر وہ ہیلن کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں گیا۔اس کے ساتھ رات گزاری اور دوسری صبح اٹھا جب اس کی پیٹھ ہیلن کی پیٹھ سے ملی ہوئی تھی۔اس نے کروٹ بدلی۔ہیلن کے چکنے چوڑے برہنہ کولہے اور شانوں پر بکھرے بال اسے بہت اچھے لگ رہے تھے مگر کوئی خاص جنسی رغبت نہیں ہو رہی تھی۔وہ ہیلن کو جگائے بغیر بستر سے اٹھ گیا۔اور روپے اس کے سینڈل میں رکھ دے۔وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر جا رہا تھا پیچھے سے ہیلن کی آواز آئی۔ڈارلنگ تم نے ایک غلطی کی ہے۔اس نے آسٹریا کی کرنسی سے صحیح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے سو شلنگ کے نوٹ کے بجائے پانچ سو شلنگ کا نوٹ سینڈل میں رکھ دیا تھا۔نہیں ڈیئر ہیلن تم یہ رکھ لو تم نے مجھے بہت خوش کیا۔اس نے مسکراتے ہوئے ہیلن سے کہا۔ہیلن کے چہرے پر تشکر کا تاثر پیدا ہوا۔وہ کود کر بستر سے اتری اور آ کر مرساں کے دونوں گالوں پر پیار کیا۔یقیناً یہ وہ بوسے تھے جو اس نے شاید پہلی مرتبہ غیر ارادی طور پر جذبات سے مغلوب ہو کر دیے تھے۔اس نے مرساں کے جذبات کو پھر بھڑکا دیا۔مرساں نے دوبارہ ہیلن کو بستر پر لٹا دیا پھر ایک ہارے ہوئے جواری یا جیتے ہوئے جواری کی طرح وہ فیصلہ نہیں کر سکا واپس دروازے پر جا کر مسکراتے ہوئے وہ گڈ بائی کہتا ہوا رخصت ہوا......کچھ دنوں کے بعد مرساں کو اپنے خط کا جواب الجیر سے موصول ہوا۔

ڈیئر پیٹرس

ہم الجیر میں خیریت سے ہیں۔بچے تمہیں یاد کرتے ہیں اور تمہیں دوبارہ دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تم بے سمت یا بے منزل مسافر ہو تو پھر کیوں نہیں الجیر واپس آ جاتے۔تمہارے رہنے کے لئے یہاں بہت جگہ ہے۔ہم سب یہاں خوش ہیں۔اگر تم واقعی خوشی کی تلاش میں ہو تو یہاں آؤ تمہیں ملے گی۔ہم سب تمہارے پیار کے منتظر ہیں۔

تمہاری۔روز،کیلری،کیتھرین۔

مرساں نے الجیر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔جینیو کے راستے ہوتے ہوئے وہ واپس جانے لگا۔اور کسی کو کوئی اہم فیصلہ کرنے کے لئے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے مگر مرساں اب اپنی تنہائی سے تنگ آ گیا تھا۔اب اسے فیصلوں کے لئے خوش رہنے کے لئے لوگوں کی ضرورت تھی،دوستوں کی ضرورت تھی۔

اس ٹرین میں جو اسے شمالی اٹلی کو پار کراتی ہوئی جینیو لے جا رہی تھی سفر کرتے ہوئے اس کے کانوں میں وہ صدائیں آ رہی تھیں جو اسے اپنی جانب پیار اور محبت سے بلا رہی تھیں۔خوشی اور مسرت کے ترانے بج رہے تھے۔جب وہ سائی پیرس پہنچ رہا تھا جہاں بہار چھائی ہوئی تھی تو وہ پھر ہلکا سا بخار محسوس کرنے لگا تھا۔مگر کوئی خوشگوار سوچ اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔شام ہو چلی تھی۔سمندر قریب آ رہا تھا۔میدانوں میں زیتون کے درختوں پر سورج کی سنہری کرنیں ابھی پڑ رہی تھیں۔اس کا دل بھی منور ہو رہا تھا۔ریل کی پٹریوں پر بھاگتی پہیوں کا شور وغل۔بھرے ڈبے میں موجود لوگوں کی بلند آواز میں گفتگو۔ہنسی مذاق،قہقہے اب اسے بہت اچھے لگ رہے تھے اس کا دل و دماغ اب اس ہنگامے سے ہم آہنگ تھا جیسے وہ اپنی تنہائی کے کرب سے باہر آ رہا ہو۔ساتھ ہی جینیو بھی آ رہا تھا۔پُر رونق ساحلِ سمندر اور شہر جہاں رات گئے تک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔وہ محبت کا بھوکا پیاسا تھا۔خوشی کا متلاشی۔وہ خواہشات جو اندر سے اس کے اندر ایک آگ پیدا کر رہی تھیں وہ اسے کشاں کشاں کھینچتی ہوئی بندرگاہ کے دوسرے سرے پر واقع ایک چھوٹے سے تفریحی سمندری کنارے پر لے گئیں۔وہ نمکین پانی میں بے تھکان تیرتا رہا حتیٰ کہ پھر وہ اتنا تھک گیا کہ اسے اپنے جسم کا بھی احساس نہیں رہا پھر وہ شہر کے قدیم حصہ کی تنگ اور پتلی گلیوں میں گھومتا رہا نظارے کرتا رہا۔دو دن وہ جینیو میں ٹھہرا۔بازاروں میں گھومتے ہوئے،حسین عورتوں کو گھورتے ہوئے۔اپنے جذبات پر کسی حد تک قابو پاتے ہوئے صرف ذہنی عیاشی کرتے ہوئے۔پھر تیسرے دن وہ جینوا چھوڑ کر الجیر جا رہا تھا۔

بحری سفر کے دوران وہ صبح،دوپہر اور پھر شام کو سمندر کی موجوں پر دھوپ چھاؤں،روشنی اور اندھیر کے رقص سے محوِ نظارہ رہا۔وہ اس ڈوبتے اور ابھرتے روشنی کے کھیل سے اور قدرتی مناظر سے اپنے دل کی دھڑکنوں کا موازنہ کرتا رہا۔ڈیک کی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو کر وہ سوچتا رہا کہ اسے سونا نہیں چاہئے۔اسے جاگتے رہنا چاہئے تا کہ اس کا سویا ہوا ضمیر جو اب کسی حد تک جاگ چکا ہے۔جاگتا رہے۔تا کہ جسم اور روح کو تسکین اور آرام ملتا رہے۔اسے خود اپنے آپ کو مطمئن اور خوش رکھنا ہے۔شام کے دھندلکے میں وہ لیٹا ہوا کھلے آسمان کو تک رہا تھا۔جس پر اب تارے

جھلملانے لگے تھے۔دور سمندر کے اس کنارے جہاں زمین اور آسمان مل رہے تھے وہاں شفق کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ سمندر صاف شفاف پانی کی طرح اس کی روح میں بھی پاکیزگی پیدا ہوگئی ہے۔اسے اس بات کا احساس تھا کہ کس طرح وہ جنسِ مخالف کی محبت کا بھوکا تھا۔وہ صرف شہوت کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے۔اس کی اب تک کی زندگی بندرگاہ پر آفس میں،اپنے کمرے میں سو کر گزری تھی۔پھر ہوٹل اور ریسٹورنٹ اور داشتہ۔وہ اس خوشی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔جس کے بارے میں اسے کبھی یقین نہیں تھا۔اس طرح وہ دوسروں سے مختلف نہ تھا۔بس وقتی مزہ اس نے اس سے پہلے کبھی دائمی سکون اور خوشی کے نہیں سوچا تھا۔اب ایک نئی سوچ نے جنم لیا تھا۔مثبت سوچ نے۔اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اب تک اپنے آپ سے جھوٹ بولتا رہا ہو۔مثلاً اس نے محسوس کیا کہ مارتھا سے اس کے تعلقات کسی محبت پر مبنی نہیں تھے بلکہ یہ اس کی شانِ بے نیازی یا دلربائی تھی۔اور وہ جادو اور لذت جو اس کے ہونٹوں میں تھی وہ صرف ایک برانگیختہ خواہش کی تسکین تھی۔وہ شام کو بازار میں یا سینما گھر میں مارتھا کے ساتھ جانا مردانہ فخر سمجھتا تھا۔جب لوگ مڑ مڑ کر اسے مارتھا کے ساتھ دیکھتے تھے تو اسے اچھا لگتا تھا اور اپنی بڑائی محسوس ہوتی تھی۔وہ مارتھا کے جسم کے ساتھ کھیلتے ہوئے جنسی لذت سے زیادہ اس بات سے مزے لیتا تھا کہ اتنے خوبصورت جسم کا وہ مالک ہے جس طرح چاہے وہ اسے استعمال کر سکتا ہے۔برت سکتا ہے۔مگر اب اسے بھرپور طریقے سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایسی گھٹیا محبت کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ اب سے وہ اس معصوم محبت کی شدت کو محسوس کرے گا جو خدا کسی کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس کی زندگی میں جتنی اچھائیاں تھیں اس پر برائیوں کی تہہ جم گئی تھی۔کلیری اور اس کے دوست زیگریو اور اس کی خوش رہنے کی خواہش ان سب پر مارتھا چھا گئی تھی۔مگر اب وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنی خوشی کے لئے قدم اٹھائے گا۔مگر ایسا کرنے کے لئے اس کو اپنے آپ کو وقت کے حوالے کرنا ہوگا۔اور وقت کے ساتھ سمجھوتا بہت اہم اور خطرناک تجربہ ہو سکتا ہے۔کاہلی اور سستی صرف کسی درمیانے طبقے کے شخص کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے۔زیادہ تر لوگ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ متوسط نہیں ہیں۔اسے حق حاصل تھا مگر ثبوت دینا ضروری تھا۔یہ خطرہ تو لینا تھا۔صرف ایک چیز بدلی تھی کہ وہ اب اپنے آپ کو ماضی کے قید سے آزاد پاتا تھا۔اور اس پچھتاوے سے بھی جو کچھ اس نے زندگی میں کھویا تھا۔اب وہ کچھ نہیں چاہتا تھا۔مطمئن تھا۔اس کی زندگی اب اس کے ہاتھوں میں تھی جسے برتنا چاہئے۔ان دو طویل راتوں میں جو اس نے ریل کے سفر میں گزاری تھیں اور جو خیالات رات کی تنہائی

میں اس دل و دماغ میں آئے تھے ان پر عمل کرنا چاہتا تھا۔وہ اپنی سوچ پر زندگی گزارنے کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔وہ ہر رکاوٹ کا سامنا کرے گا مقابلہ کرے گا۔وہ ہار نہیں ماننے لگا۔

جہاز سمندر میں سبک روی سے چل رہا تھا۔سمندر کی لہریں نرم روی سے جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔سمندر کی تندی اور تیزی میں کمی تھی اس کے خیالات اور جذبات میں بھی دھیرج تھی۔اس نے جذبہ محبت اور اپنی لاچارگی کو یکجا کر لیا تھا۔یہی کچھ اس کی غربت تھی اس کی دولت تھی۔اب وہ صفر سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا۔مگر ہوش مندی کے ساتھ اپنی تقدیر کا سامنا کرتے ہوئے بلکہ تقدیر کا مالک ہوتے ہوئے۔پھر دوسری صبح جہاز الجیر کے ساحل پر خاموشی سے لنگر انداز ہو چکا تھا۔وہی سمندر وہی آسمان،وہی درخت۔وہ بندرگاہ کی مخصوص خوشبو،وہی شہر وہی مکانات ہر چیز جانی پہچانی۔

یہاں پہنچ کر مرساں کو خیال آیا کہ ویانا کے بعد اس نے ایک مرتبہ بھی زیگریو کے بارے میں نہیں سوچا۔وہی زیگریو جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔اسے اپنے اندر فراموش کرنے کی اس قوت کو محسوس کیا جو صرف بچوں میں ہوتی ہے یا پھر مفکروں میں یا پھر بہت معصوم لوگوں میں۔اسے اپنی معصومیت پر بہت خوشی ہو رہی تھی۔

آخرکار وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے خوش رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

باب ہفتم

پیٹرس اور کیتھرین اپنے چبوترے پر کھلے آسمان تلے سورج کی روشنی میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ کیتھرین نہانے کے مختصر لباس میں ملبوس تھی اور لڑکا جیسا کہ مرساں کے دوست اس کو پکارا کرتے تھے نیکر پہنے بیٹھا تھا۔ گلے میں رومال بندھا ہوا تھا۔ وہ نمکین ٹماٹر، آلو، سلاد اور شہد کھا رہے تھے۔ اور پھلوں کی اچھی مقدار وہاں موجود تھی۔ انہوں نے آڑوں کو برف پر ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ انگوروں کا رس بھی نکالا ہوا ہے۔ سورج کی طرف منہ کر کے وہ مزے سے رس پی رہے تھے۔ وہ دھوپ کے مزے لے رہے تھے تا کہ ان کی پھیکی سفید رنگت سرخی مائل ہو جائے۔ وہ ایک دوسرے کے جسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کیتھرین اوندھی ہو کر لیٹ گئی اور اپنے نہانے کا مختصر لباس بکنی کو اپنے کولہوں سے نیچے کھینچ لیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا کیا یہ بے حیائی تو نہیں۔ نہیں ہے نا۔ نہیں۔ لڑکے نے بغیر دیکھے کہا۔ اس کے جسم کے مسام مرطوب ہو رہے تھے۔ اسے نیند سی آنے لگی۔ کیتھرین مستی میں اوآہ کر رہی تھی۔ واہ مزے آرہے ہیں۔ وہ خمار زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ ان کا یہ گھر ایک پہاڑی کے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ سامنے سمندر تھا۔ یہ علاقے میں ''تین طالب علموں کا گھر'' کے نام سے مشہور تھا۔ زیتون کے درختوں سے گھرا ایک پہاڑی راستہ گھر کو جاتا تھا۔ چہار دیواری پر منچلوں نے بے ہودہ تصاویر اور سیاسی نعرے لکھے ہوئے تھے۔ دیر تک سورج میں لیٹے بیٹھے رہنے کے بعد وہ پسینے میں نہائے سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر پہنچے۔ وہ اس مکان کو دنیا سے بلند گھر کہتے تھے۔ یہ گھر چاروں طرف سے پورے علاقے کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ زمین پر تعمیر شدہ مکان نہیں بلکہ ہوا میں تیرتا ہوا کوئی ہوائی غبارہ ہو جو آسمان اور زمین کے درمیان جھول رہا ہو اور بلندی سے زمین کے اطراف کا نظارہ پیش کر رہا ہو۔ نیچے پہاڑی ٹیلوں پر۔ سفیدے اور زیتون کے درختوں کا جھنڈ عجب گہری ہریالی کا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ موسم رنگ برنگے

خوشبو دار مہکتے پھولوں کا تھا۔ ہر سو بہار ہی بہار چھائی ہوئی تھی ایسے بلند مقام پر رہتے ہوئے اس مکان کے ہر مکین کو اپنی اہمیت کا اندازہ تھا۔ گھر میں رہائش پذیر چاروں اشخاص کو اپنی حیثیت کا اندازہ تھا۔ ہر بندہ اپنی اپنی جگہ مطمئن اور اپنے مقام کو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتے کے ساتھ رہ رہے تھے تا کہ ہر ایک اپنی جگہ خوش و خرم رہے۔ پیٹرس اپنی کوئی خاص رائے نہیں رکھتا تھا۔ کیتھرین کو اکثر برہنہ رہنے کا مقصد یا فائدہ یہ محسوس ہوتا کہ جیسے اس پر کوئی پابندی نہیں اور وہ اپنی سوچ اور اندازِ زندگی میں آزاد ہے۔ وہ لڑکے کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چبوترے پر کھلے آسمان تلے ننگی ہو جاتی تھی۔ رات کے کھانے پر وہ فخریہ کہتی کہ میں دنیا کے سامنے بے لباس تھی۔ مرساں طنزیہ کہتا کہ ہاں عورتیں قدرتی طور پر گھٹیا جذبات کو اپنے اچھے خیالات پر ترجیح دیتی ہیں۔ کیتھرین اس پر اعتراض کرتی۔ وہ اپنے آپ کو ذہین سمجھتی تھی۔ روز اور کلیری ہم آواز ہو کر کہتیں۔ خاموش رہو۔ کیتھرین تم غلط ہو۔ کسی نہ کسی طرح یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ کیتھرین ہمیشہ غلط سوچتی ہے۔ صرف کیتھرین ہی نہیں بلکہ ہر کوئی ایک دوسرے کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتا تھا۔ کیتھرین کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ وہ قدرتی مظاہر درخت، ہوا، پانی کے خفیہ زبان کو سمجھتی ہے۔ اس کے لئے اپنے انسانی جسم کے ساتھ حیوانی خواہشات ہی سب سے بہتر بات تھی۔ کلیری کہتی کہ اس کے کھانے کی بے تحاشہ خواہش بھی حیوانی ہے۔ انہی سوچوں کے ساتھ وہ سب باہر دھوپ تاپنے بیٹھ جاتے اور خاموش رہتے۔ آدمی انسان کا دشمن ہے۔ دنیا نے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ جیسے روز، کلیری، کیتھرین اور پیٹرس ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ ہنس بول کر دوستی کا اظہار کرتے ہوئے وہ دراصل ایک دوسرے کے ساتھ چال چل رہے تھے، کھیل کھیل رہے تھے۔ سمندر اور آسمان کے درمیان رہتے ہوئے وہ اپنے اپنے مقدر کے تحت جی رہے تھے۔ اسی روز مرہ کے شب و روز کے درمیان کبھی کبھی ان کی پالتو بلی بھی ان کے کھیل میں شامل ہو جاتی تھی۔ گلہ بلی ان کے درمیان اچھلتی کودتی۔ اس کی سبز آنکھوں میں تجسس کا نشان تھا۔ وہ دیوانہ وار اچھلتی کودتی اور روشنی اور سائے کا پیچھا کرتی بلی کی ان حرکتوں پر روز خوب ہنستی۔ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔ اس کے گھنگیارے بال اس کی آنکھوں پر لگے گول شیشے والے چشمہ پر آجاتے۔ پھر گلہ بلی کود کر اس کی گود میں آجاتی خاص طور پر اسی کی گود میں روز اس کی ریشمی بالوں پر اپنے ہاتھ پھیرتی رہتی۔ روز کو اس عمل سے ایک طرح سے عجب سی تسکین ملتی تھی۔ زندگی

سے فرار۔ بالکل اسی طرح جیسے کیتھرین کو برہنہ ہوکر۔ کلیری دوسری کالی بلی کو پسند کرتی تھی یہ کالی بلی کھاتی بہت تھی اسی وجہ سے خوب فربہ اندام ہورہی تھی۔ بدصورتی کی حد تک کلیری کہتی ایک خوبصورت وجود کو بدصورت ہونے کا کوئی حق نہیں۔ مگر روز مداخلت کرتی اور کہتی تمہیں ایسے کہنے کا کوئی حق نہیں۔ کھاؤ خوب کھاؤ میری پیاری بچی۔ پھر دن کا ابھرا سورج شام کو ڈھلنے لگا۔ پہاڑوں پر سمندروں پر اندھیرا چھانے لگا۔ وہ ہنستے رہے ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے۔۔ منصوبے بناتے رہے۔ کبھی کبھی مرساں حیران ہوتا تھا اس دنیا سے جو انہوں نے اپنے گرد بنا رکھی تھی۔ دوستی اور بھروسہ۔ دنیا سے بلند و بالا یہ گھر وہ کہتے تھے کہ صرف وقتی مسرت کے لئے نہیں ہے بلکہ دائمی خوشی کے لئے۔ مرساں سمجھتا تھا کہ یہ صحیح ہے کیونکہ جب رات ہوتی تھی تو ان کے اندر خطرناک حد تک نفسانی خواہشات جنم لے لیتی تھیں۔

آج صبح آفتابی غسل کے بعد کیتھرین اپنے دفتر چلی گئی تھی۔

میرے پیارے پیٹرس روز نے اچانک آتے ہوئے کہا۔ میرے پاس تمہارے ایک خوشخبری ہے۔ لڑکا (مرساں) باہر ٹیرس پر ایک صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی جاسوسی ناول تھا۔ کہو میری جان روز میرے کان تمہارے لئے حلقہ بگوش ہیں۔ آج باورچی خانے میں تمہاری باری ہے۔

بہت خوب پیٹرس نے بغیر اٹھے جواب دیا۔ روز نے اپنے بستہ میں لنچ کے ساتھ لیوسی کی بور کردینے والی تاریخ کی تیسری جلد بھی ٹھونسی اور پڑھنے چلی گئی۔ پیٹرس نے دال پکانے کو سوچا اور باورچی خانے میں گیارہ بجے تک رہا۔ پہلے اس نے دال ابالنے کے لئے رکھ دی۔ پھر فرائی پین میں کچھ تیل ڈالا اور ایک پیاز کتر کر ڈال دی تاکہ وہ بھن کر سرخ ہوجائے۔ پھر اس نے ٹماٹر بھی کاٹ کر ڈال دئے۔ بلیوں کو اس نے کوسا جو اس کے گرد بھوک سے منڈلا رہی تھیں۔

کیتھرین پونے بارہ بجے واپس آئی۔ اور آتے ہی نہانے گھس گئی پھر دھوپ میں آبیٹھی۔ وہ سب سے آخر میں کھا۔ کی ٹیبل پر آئی۔ روز نے کہ کیتھرین تم ناقابلِ برداشت ہو۔ اسی دوران کلیری ہانپتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ سونگھتے ہوئے کہنے لگی توبہ پھر وہی دال۔ مجھے معلوم ہے کلیری تم گاڑھی کریم کی شوقین ہو۔ مرساں نے کہا۔ مرساں بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ روز نے بلند آواز سے کہا جو ابھی ابھی آئی تھی۔ چلو آؤ سب لوگ کھانے بیٹھ جاؤ۔ مرساں نے سب کو

دعوتِ طعام دیا۔ وہ ہمیشہ باورچی خانے میں ہی کھانا کھاتے تھے۔ یہ باورچی خانے کے ساتھ ساتھ ایک عام کمرہ تھا۔ ان چاروں کا بیشتر وقت کھانے کے علاوہ بھی یہاں گزرتا تھا۔ کیتھرین اپنے دفتر کا ذکر اکثر لے بیٹھتی تو روز اسے ڈانٹتی کہ تم اپنا دکھڑا ہمارے سامنے مت رویا کرو۔ جب کلیری کی کھانا پکانے کی باری ہوتی تو وہ اپنے پکائے ہوئے کھانے کو چکھ کر کہتی واہ کتنا مزے دار ہے۔ مرساں اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے خاموش رہتا مگر باقی سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ کیتھرین پر اپنا رونا روتی رہی کہ کوئی اس کے آفس جا کر اتنے لمبے وقت کی شکایت کرے۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ روز نے کہا کیونکہ تم ہی تو ہو جو کام کرتی ہو۔ کیتھرین پھر باہر جا کر دھوپ میں لیٹ گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد سب باہر آگئے۔ کیتھرین کے نرم بالوں کو چھوتے ہوئے کلیری نے چہک کر کہا کہ اس بچی کو کسی مرد کی ضرورت ہے۔ اس گھر میں یہ عام بات تھی کہ ہر کوئی کیتھرین کو ہی نشانہ بناتا تھا۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ وہ اب زیادہ عمر کی ہورہی ہے۔ مگر کوئی اس کی اس بات پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ روز کہتی بے چاری کیتھرین اسے کوئی محبت کرنے والا چاہئے۔ پھر وہ سارے دھوپ تاپنے بیٹھ گئے۔ کیتھرین جو کبھی کسی کی بات کا برا نہیں مانتی تھی اپنے آفس کے بارے میں گپیں سنانے لگی کہ اس کے آفس کی میڈموزیل پیرس لمبی اور سنہری بالوں والی کی جلد ہی شادی ہونے والی ہے۔ وہ لمبوتری سب سے مشوہ کرتی پھر رہی ہے کہ وہ شادی کو کیسے بھگتے گی۔ پھر جب اس کی شادی ہوگئی تو ہنی مون سے واپس آکر کہنے لگی شادی کا تجربہ اتنا برا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ کیتھرین نے ترس کھانے کے انداز میں سب کو بتایا کہ وہ تیس سال کی ہے۔ روز نے اعتراض کرتے ہوئے کہا چپ کرو ہم سب اب لڑکیاں نہیں ہیں۔ عورتیں ہیں۔

اگلے اتوار کو کچھ مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس روز کلیری کی باورچی خانے میں باری تھی۔ روز نے سبزی کاٹی اور کھانے کی میز کو سجایا۔ کلیری نے سبزی چولہے پر چڑھا دی اور کتاب پڑھنے بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی اٹھ کر پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر پکتی سبزی کا معائنہ کرلیتی تھی۔ گھر کا کام کاج کرنے والی عرب لڑکی مینا آج نہیں آئی تھی۔ ایک سال میں یہ اس کا تیسرا سوتیلا باپ تھا جو اس نے کھویا تھا۔ روز نے گھر کی صفائی ستھرائی کی۔ ایلن پہلی مہمان تھی جو آئی۔ مرساں نے اسے ''منہ پھٹ'' کا خطاب دیا ہوا تھا۔ تم مجھے ایسا کیوں سمجھتے ہو ایلن مرساں سے پوچھتی تھی تو وہ جواب میں کہتا کہ کسی شے کی اصلیت اور سچائی تمہارے لئے

پریشان کن ہوتی ہے۔کیا سچ صرف کڑوا ہوتا ہے اچھا نہیں ہوتا۔بہر حال ایلن دل کی اچھی تھی۔وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھی۔جو وہ پہلی مرتبہ اس دنیا سے بلند گھر میں آئی تھی تو آتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس گھر کے رہائش پذیر لوگوں سے سحر زدہ ہوگئی ہے کیونکہ یہ کھلے دل کے لوگ ہیں کچھ پوشیدہ نہیں رکھتے۔یہی سوچتے ہوئے وہ بھی جو کچھ اس کے دل میں آتا تھا بغیر کسی جھجک کے کہہ دیتی تھی۔اور وہ لوگ کہتے ایلن تم بیوقوف ہو جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو۔ایلن دوسرے مہمان نویل کے ساتھ کچن میں آئی۔نویل ایک سنگ تراش تھا۔وہ آتے ہی کیتھرین سے ٹکرایا جو ہمیشہ سے اول جلول تھی۔اس وقت وہ بے ڈھنگے پن سے فرش پر لیٹی ایک ہاتھ سے انگور کھا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے دہی پھینٹ رہی تھی۔روز نے بڑا سا نیلے رنگ کا ایپرن پہنا ہوا تھا۔وہ گلہ بلی کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جو لالچی لذیذہ انداز سے اپنی زبان منہ پر پھیر رہی تھی کہ کچھ کھانے کو مل جائے۔روز نے ہنستے ہوئے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ جانور کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ہاں کیتھرین نے قدرے غصے میں کہا کہ اس بلی نے اپنا آج کا پورا کام کر دکھایا ہے۔صبح ہی وہ چھوٹا ہرا لیمپ اور ایک گل دان توڑ چکی ہے۔ایلن اور نویل نے اپنے آپ کو مہمان جتانے سے پہلے ہی کسی کو تکلیف دیئے بغیر خود ہی بیٹھ گئے۔کلیری آئی اور اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور چولہے پر پکتے ہوئے سالن کو چکھا۔کھانا تیار تھا مگر آج مرساں کو دیر ہوگئی تھی۔پھر جب وہ آیا تو بہت موڈ میں تھا وہ ایلن سے کہنے لگا آج مزہ آگیا۔ابھی آتے ہوئے بڑی حسین لڑکیوں سے سامنا ہوا۔گرمی کا موسم شروع ہو چکا ہے۔لڑکیاں مختصر لباس پہنے لگی ہیں۔باریک جھلکنے والا۔میرا تو دل مچل گیا اور......اور ایلن اس کی اس بے ہودہ باتوں سے تنگ آ کر خاموش ہوگئی تھی۔

کھانے کی ٹیبل پر پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔پہلا ہی چمچہ منہ میں ڈالنے کے بعد ہی کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کلیری نے صفائی پیش کی کہ شاید اس سے پیاز جل گئی ہے۔ارے نہیں نویل نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔مزے دار تو ہے۔مرساں نے اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے کچھ نہ کہنے کو سوچا حتیٰ کہ سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

روز نے بتایا کہ اس گھر میں کچھ ضروری سامان کی ضرورت ہے۔مثلاً گرم پانی کا ہیٹر،ایرانی قالین اور ایک ریفریجریٹر وغیرہ۔نویل نے دل بڑھانے کو کہا کہ ہاں ہاں دعا کرو کہ میری لاٹری نکل آئے۔روز سنجیدہ ہوگی اور کہنے لگی ہم سب کو اپنے لئے دعا کرنی

چاہئے۔اچھی خاصی گرمی ہوگئی تھی اس نے برف سے ٹھنڈی کی ہوئی وائن کا مزہ دوبالا کر دیا تھا۔اور پھلوں کا مزہ بھی،کافی پینے کے دوران ایلن نے موضوع گفتگو کو محبت کی طرف موڑ دیا۔کیتھرین نے کہا کہ اگر تمہیں کسی سے واقعی محبت ہوگئی ہے تو بہتر ہے تم اس سے شادی کر لو۔کیتھرین نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ انسان جب محبت میں ہو تو یہ زیادہ ضروری ہے کہ وہ صرف محبت کر رہا ہو۔حقیقی محبت نہ کہ کوئی فلسفیانہ محبت۔روز کہنے لگی بشرطیکہ شادی محبت کو ختم نہ کر دے۔مگر ایلن اور کیتھرین نے اس کے برعکس اپنی سوچ کا اظہار کیا۔بلکہ زبردستی منوانے کی کوشش کی۔نویل جو سنگ تراش ہونے کے ناطے مٹی گارا اور پتھر کو کسی مخصوص ٹھوس شکل میں دیکھنے کا عادی تھا وہ حقیقی زندگی میں بیوی،بچے اور جذبات پر یقین رکھتا تھا اور خاندانی روایت پر پھر روز جو ایلن اور کیتھرین کی رائے سے سخت اختلاف رکھتی تھی اچانک اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ آخر نویل کیوں بار بار آتا ہے۔میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں مگر مجھے یہ بتاتے ہوئے بڑی مشکل درپیش ہے کہ اس انکشاف نے مجھے مغلوب کر دیا ہے۔میں اپنے سلسلہ میں کل اپنے ابا سے بات کروں گی بلکہ تم خود ایک دو دن بعد ان سے درخواست کرنا۔مگر مگر نویل نے کچھ اس انداز سے سوال کیا جیسے وہ بات کو سمجھا نہ ہو۔روز نے پوری ہمت سے کہا مجھے معلوم ہے میں سب سمجھ رہی ہوں تمہارے کچھ کہنے سے پہلے۔تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی زبان بند رکھتے ہیں کہ دوسرے خود اندازہ لگائیں کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔مجھے خوشی ہے کہ بہر حال تم نے اعلان کر ہی دیا بغیر کوئی لفظ استعمال کئے ہوئے کہ تمہیں مجھ سے دلچسپی ہے۔تمہاری مجھ میں لگاتار دلچسپی نے آخر کار میری شہرت کو داغ دار کر ہی دیا۔نویل مبہم طور پر اندر سے خوش تھا اور کچھ محتاط بھی۔مگر اپنی حرکات وسکنات سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ اس کی خاموش ڈپلی کامیاب ہوئی۔مرساں نے بغیر کسی شک وشبہ کے سگریٹ سلگانے سے پہلے نویل سے کہا تمہیں اس سلسلہ میں جلدی کرنی ہوگی۔روز کے حالات کا خیال رکھتے ہوئے تمہیں چند اہم قدم فوری طور پر اٹھانے ہوں گے۔وہ کیا۔نویل نے اچانک سوال کیا۔

خدارا سمجھنے کی کوشش کرو۔کلیری نے کہا۔یہ اس کا ابھی صرف دوسرا مہینہ ہے۔دوسرے روز نے قدرے نرمی سے کہا کہ تم اب اس عمر میں پہنچ چکے ہو جب تم اپنا چہرہ کسی دوسرے شخص کے منہ میں تلاش کرنے میں عار نہیں سمجھو گے۔نویل نے اس بات پر نفرت کا اظہار کیا۔کلیری نے کہا یہ ایک طرح سے فطرتی افعال ہے۔یہ تو صرف ایک مذاق تھا نویل برا نہ مانو۔آؤ سب لوگ اندر

چلیں۔اوراس موقع پر اصولی بحث ختم ہوئی۔

روز جو اپنے کسی اچھے کام کی پرچار نہیں کرتی تھی۔ایلن سے محبت سے بولی جب کہ وہ بڑے کمرے میں موجود تھی اور مرساں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔کلیری ٹیبل پر جھکی بیٹھی تھی۔کیتھرین حسب عادت فرش پر لمبی پڑی تھی۔دور سے لوگ کاوچ پر بیٹھے تھے۔

ان دنوں بندرگاہ اور پورے شہر پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔مگر بندرگاہ پر کام پورے زور و شور سے جاری تھا۔جہاز کی آمدورفت کا پتہ ان کے بلند سیٹی سے ہوتا تھا۔جیسے ملاح گفتگو کہتے تھے۔بندرگاہ پر لنگر انداز جہاز اپنے کالے اور سرخ رنگوں میں اپنے زنگ آلود لنگر اور فولادی زنجیروں سے جکڑے کھڑے تھے۔ہر طرف بساند مچھلی اور تیل آلود سمندری پانی کی پھیلی ہوئی تھی۔ایلن نے روز سے مایوس کن لہجے میں کہا تو پھر تم بس میری طرح ہو نہیں روز نے جواب دیا میں تو بس خوش رہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔اتنی خوشی جتنی زیادہ سے زیادہ ممکن ہو۔اور اس خوشی کے لئے صرف محبت ہی ایک راستہ نہیں ہے۔مرساں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بغیر مڑے ہوئے یہ بات کہی۔وہ ایلن کو بہت پسند کرتا ہے۔اسے لگا کہ جیسے اس نے اس کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی ہو۔ایلن نے طنزیا کہا۔ایک متوسط سوچ۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ ایک معمولی سوچ ہے۔مگر یہ صحت مند سوچ ضرور ہے۔مرساں نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔روز اپنی آنکھیں بند کئے اپنی سوچوں میں گم تھی۔گلہ بلی کود کر اس کی گود میں آ گئی تھی۔بلی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے روز تصور کر رہی تھی کہ خفیہ شادی میں ترچھی آنکھ والی بلی ہو یا نیم خوابدہ عورت ہو وہ دنیا کو ایک ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہوں گی۔

مرساں اس وقت لوسی رینل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔جب اس نے یہ کہا تھا کہ وہاں باہر سڑک پر خوبصورت عورتیں اسے ملیں تھیں تو اس کے ذہن میں صرف وہ لوسی تھی جس سے وہ اپنے ایک دوست کے گھر پر ملا تھا۔ایک ہفتہ پہلے وہ دونوں باہر ایک ساتھ گھومنے گئے تھے۔اور بلا مقصد ادھر اُدھر ساحلِ سمندر کے کنارے ٹہلتے رہے۔لوسی خاموش تھی پھر جب وہ اسے چھوڑنے اس کے گھر جا رہا تھا تو مرساں نے محسوس کیا کہ وہ سارے راستے لوسی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے مسلتا رہا ہے اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔لوسی خاصی لمبے قد کی تھی اس کے سر پر کوئی ہیٹ نہیں تھی وہ سفید لی لن کی ایک فراک پہنے تھی اور پاؤں میں سینڈل۔اس

وقت تیز ا ہوا چل رہی تھی۔لوسی قدم جما جما کر چل رہی تھی۔ہوا کے زور سے اس کا لباس جسم سے لپٹ اور چپک رہا تھا اور اس کے جسم کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔اس کے سنہری بال پیچھے شانوں پر لہرا رہے تھے۔اس کی چھوٹی سی ستواں ناک،اس کے شاندار گدرالے،جوبن کا ابھار۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی خفیہ سمجھوتہ کے تحت اپنے آپ کو اس دنیا میں پیش کر رہی ہو اور اپنی اداؤں سے دنیا کو چلا رہی ہو۔اس کی دائیں کلائی میں ایک خوبصورت سا پرس لٹک رہا تھا۔اس نے اپنا الٹا ہاتھ اپنے سر پر سورج کی تپش سے بچنے کے لئے اٹھایا ہوا تھا۔وہ شانِ بے نیازی سے دلربائی چال سے اپنے ساتھ ہم قدم مرساں کو لبھا رہی تھی۔اسی لمحے ایک پراسرار یکسانیت اسے لوسی کے ساتھ محسوس ہونے کا تجربہ ہوا۔وہ بغیر کسی شعوری کوشش کے لوسی کے ساتھ ہم قدم رہا۔مرساں لوسی کے چہرہ کے تاثرات کو باوجود اس کی خاموشی کے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بہت سمجھدار لڑکی نہیں لگتی اور اس بات نے اس کو خوش کیا۔اس الھڑ پن کا اپنا قدرتی حسن تھا۔پھر جب وہ لوسی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں کافی دیر تھامے رکھا۔اس نے وعدہ لیا کہ وہ پھر ملے گی۔وہ پھر اسی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے لمبی سیر کریں گے۔سورج کی روشنی میں،چاندنی راتوں میں،اندھیری راتوں میں ستاروں کی چھاؤں میں۔ٹھنڈے پانی میں ایک ساتھ تیر کر تازہ دم ہوں گے۔بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کے جسم کی قربت سے لطف اندوز ہوں گے۔

اور گزشتہ شب مرساں نے اس کے رسیلے ہونٹوں میں کھو جانے والا معجزہ پھر سے پالیا۔اس سے پہلے تو وہ اس کے لباس اور زیبائش سے متاثر ہوتا رہا تھا۔اس کی خاموشی اس کی مکمل سپردگی کی علامت تھی۔کل رات،رات کے کھانے کے بعد وہ ڈاک یارڈ کے علاقے میں ٹہلتے ٹہلتے وہ اس ڈھلانی راستے پر پہنچ گئے جو بلیوارڈ کی طرف جاتا تھا۔وہاں وہ کچھ دیر کے لئے رکے۔لوسی مرساں کے ساتھ لپٹ گئی۔وہاں اندھیرے میں مرساں نے لوسی کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔اس کے دباؤ سے لوسی کا دہانہ کھل گیا اور گرم مرطوب لب کشادہ ہو گئے۔مرساں کی طبیعت میں ایک مبہم مگر پر جوش جذبہ بیدار ہوا۔وہ ستاروں بھری رات جس کی جگمگاہٹ سے آسمان تلے وہ شہر مانو ایسا لگتا تھا جیسے دودھ میں نہایا گیا ہو۔انسانی گرم جوشی سے مچلتا ہوا شہر،ساحلِ سمندر سے چلنے والی تیز و تند ہواؤں میں نہایا ہوا۔اس نے لوسی کے تھرتھرانے والے لبوں سے،مدبھرے ہونٹوں سے

اپنی پیاس کی شدت بجھانے کے لئے اپنے کپکپاتے ہونٹ اس کے دھانے میں پیوست کردئے۔مگر وہ نہ بجھنے والی پیاس لگتی تھی وہ انسان کے اندر چھپی ہوئی غیر انسانی خواہشات کو پوری کرنا چاہتا تھا وہ لوسی پر جھک گیا۔اسے ایسا لگا جیسے اس نے کسی پھڑ پھڑاتے پرندے کو جکڑ لیا ہو۔لوسی کراہارہی تھی۔اس کے گلے میں آہ آہ کی آواز پھنس کر رہ گئی تھی۔وہ مسلسل اس کے ہونٹوں کو چوسے جارہا تھا وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خمار ومستی کی ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔تسکین اور لذت کے بہتے دریا میں تیر رہا ہو۔لوسی نے مرساں ل کو یوں لپیٹا ہوا تھا جیسے کوئی ڈوبتی لڑکی بار بار ابھرنے کی کوشش کر رہی ہو اس گہرائی سے جس میں وہ ڈوب رہی ہو۔وہ اپنے لب مرساں کے لب سے الگ کرتی اور پھر فوراً ہی دبوچ لیتی۔وہ اس سرد پاتال میں تحت الثری میں اس کی عمیقیں۔بے پایاں اتھاہ گہرائی میں ڈوبی رہنا چاہتی تھی۔اور ڈوب کر امر ہو جانا چاہتی تھی۔

ایلن اب رخصت ہو رہی تھی۔ایک لمبی خاموش دوپہر مرساں کے سامنے تھی۔رات کے کھانے پر سب خاموش تھے۔پھر وہ سب باہمی رضامندی سے باہر ٹیرس پر آگئے۔دن پر دن گزرتا رہا صبح کے وقت خلیج پر دھند اور دھوپ اور شام کے وقت مطلع صاف ہو جاتا۔ہر صبح سورج طلوع ہوتا اور شام کو پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتا یہی دنیا کی ریت تھی۔کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔یہی زندگی حقیقت،یہی زندگی فسانہ،یہی صبح زندگی،یہی شام زندگی اس دنیا سے بلند گھر میں بھی قائم تھی۔ہنسی مذاق اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں۔ہر روز کا خاتمہ شام کو کھلے ٹیرس پر سب کا جمع ہونا۔تاروں بھری رات میں دیر گئے تک پڑے رہنا۔

روز اور کلیری اور مرساں دیوان پر ٹانگیں پھیلائے پڑے تھے۔کیتھرین منڈیر پر بیٹھی تھی۔آسمان پر رات اپنے پراسرار اور چمکتے چہرہ کے ساتھ جلوہ گر تھی۔نیچے فاصلے پر بندرگاہ پر روشنی ہو رہی تھی۔اور کبھی کبھی ٹرین گزرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ستارے ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ایسا لگتا تھا کہ رات کی خاموشی نے اپنی منزل پالی ہو۔وہ سب آسمان کو تکتے ہوئے اس کی انتہا گہرائی میں گویا ڈوبے جارہے تھے۔یا بہ الفاظِ دیگر آسمان کی نہ ختم ہونے والی وسعت میں محوِ پرواز تھے۔کیتھرین نے اچانک ایک ٹھنڈی سانس بھری۔کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے۔مرساں صرف یہ پوچھ سکا۔روز کہنے لگی سب کچھ یہاں کتنا اچھا لگ رہا ہے۔کلیری کھڑی ہوگئی اور اپنا

ہاتھ منڈیر پر ٹیک دیا۔اور اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہنے لگی اس دنیا میں ہر شے بنیادی طور پر کتنی سچی اور اچھی ہوتی ہے۔اس نے اپنی موجودہ زندگی کو اپنے تصوراتی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔اپنی خواہشات کو ستاروں کی چال سے وابستہ کر دیا۔پھر اچانک مڑ کر مرساں سے کہنے لگی اچھے دنوں میں اگر تم اپنی زندگی پر بھروسہ کرو تو زندگی ضرور تمہیں جواب دے گی۔ہاں شاید تم صبح کہہ رہی ہوگی۔کہیں دور آسمان پر کون تارا ٹوٹا اور اس کی روشنی کی ایک لمبی شعاع دور تلک پھیل گئی اور پھر وہی اندھیرا۔کچھ لوگ اوپر کے راستے پر چڑھ رہے تھے۔اس رات کی خاموشی میں ان کے قدموں کی آواز آرہی تھی اور گہری تھکاوٹ والی سانس۔پھر پھولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں تک پہنچی۔دنیا ہمیشہ سے ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے۔اور وہ صبر کی سچائی جو ستارے سے دوسرے ستارے تک پہنچتی ہے۔وہ ایک آزادی قائم کرتی ہے جو ہمیں اپنے آپ سے چھٹکارا دلاتی ہے اور دوسروں سے بھی ایسے جیسے دوسری صبر کی سچائی ہو جو موت سے موت تک جاتی ہے۔مرساں،کیتھرین،روز اور کلیری کو اس خوشی کا احساس ہوا جوان کے اندر اس دنیا کو ترک کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔اگر آج کی رات کسی طور پر ان کی قسمت سے وابستہ تھی۔تو وہ ان کے لئے انوکھی بات ہوگی کہ وہ ایک ہی وقت میں اتنی جسمانی شہوانی اور دنیاوی ہوگی اور ساتھ ہی خفیہ بھی خوشی اور غم ایک دوسرے میں مدغم۔ان کے دلوں کی آواز نے یہ سبق سیکھ لیا تھا۔دوہرا سبق جو موت کو خوشی قبول کرنے کا تھا۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔دیر ہو چکی تھی۔ستارے آسمان پر ٹمٹمانے لگے تھے۔صبح کی آمد کی نشانی۔پیٹرس مرساں نے اپنے دوستوں کو دیکھا۔کیتھرین منڈیر پر بیٹھی تھی۔گردن پیچھے کی طرف جھکا کر۔روز دیوان پر نیم دراز تھی اور گود میں گلہ بلی کلیری دیوار کا سہارا لے کر کھڑی تھی۔ٹھنڈک کچھ بڑھ گئی تھی۔وہ سب کے سب اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔زندگی اور موت،خوشی اور غم۔رات اور پھر صبح کے گردشِ دوران میں مبتلا۔ان کے قدموں کے نیچے پورا الجیر پھیلا ہوا تھا۔وہ شہر جس کے وہ باسی تھے۔جوان کا وطن تھا۔جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور جہاں شاید اسی کی مٹی میں واپس جائیں گے۔

صبح تڑکے کا وقت تھا۔دھند چھائی ہوئی تھی۔ایسے میں مرساں کی گاڑی کی تیز روشنی دھند کو چیرتی ہوئی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ شاہراہ پر تیز رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔وہ الجیر چھوڑ رہا تھا۔راستے میں وہ گوالوں کی دودھ گاڑی کو پار کرتا رہا۔گھاس پھوس اور گھوڑوں کی مخصوص مہک سے اسے صبح کی تازگی مزید احساس ہو رہا تھا۔ابھی تک فضا میں ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔آسمان پر

صبح کا تارا ڈوبنے کو تھا۔سنسان سڑک پر اب وہ صرف اپنی گاڑی کی آواز سن رہا تھا۔اس نے اپنی گاڑی کی رفتار اور تیز کردی۔آہستہ آہستہ اندھیرا دور ہوگیا اور پوری طرح دن نکل آیا تھا۔

اب وہ ایک خالی سڑک پر اونچائی کی طرف چڑھ رہا تھا۔نیچے دور سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ڈامر کی سڑک پر اس کی گاڑی کے ٹائروں کی آواز بڑھ گئی تھی۔پہاڑی راستے پر ہر موڑ پر بریک لگانے پر ٹائر چیختے تھے۔پھر ڈھلان پر وہ ساحل کے قریب سے گزر رہا تھا تو اب اسے سمندری موجوں کی آواز آرہی تھی۔کوئی شخص صرف ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے اندر بیٹھے ہوئے نیچے کی دنیا کی ہر آواز سے بچا رہتا ہے۔اپنی حرکات وسکنات پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اب مرساں اپنے متعلق اطمینان سے سوچ رہا تھا۔اس کے پاس سارا دن تھا۔وہ انہیں اونچائی اور ڈھلائی پر گاڑی بھگاتا رہا کبھی کھیت کھلیان سے گزرا تو کسان کام کرتے نظر آئے۔کچی آبادی کے آس پاس زیتون کے درختوں کا باغیچہ اور پائن کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے لال کھپریل اور سفیدی کئے ہوئے کسانوں کے اور دوسرے دہقانی لوگوں کے گھر موجود تھے۔

ایک ماہ پہلے اس نے اس دنیا سے اونچے گھر میں آنے کا اعلان کیا تھا۔مگر وہ اب پھر سفر کررہا تھا۔پھر شاید الجیر کے قریب ہی کہیں بس جائے گا۔چند ہفتوں کے بعد وہ پھر واپس آگیا۔اس بات پر قائل ہوتے ہوئے کہ سفر اب اس کے لئے ایک انجانی زندگی ہو کر رہ گئی ہے۔اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنا ایک بے قرار دل کے لئے وقتی خوشی سے زیادہ کچھ نہیں۔اب وہ اندر سے تھک چکا تھا۔وہ اپنے منصوبہ پر عمل کرنے کے لئے بے چین تھا۔اس نے ایک چھوٹا سا گھر جینو میں کہیں خریدنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔کہیں ساحل سمندر اور پہاڑیوں کے درمیان والی کوئی جگہ۔ایسی جگہ ٹیپاسا کے کھنڈرات کے قریب کا کوئی مقام ہوسکتا ہے۔جب وہ الجیر آیا تھا تو اس نے اپنی زندگی کو بسانے کا سوچ لیا تھا۔اس نے ایک بھاری رقم جرمنی کی کسی دوا کی کمپنی میں لگایا تھا۔ایک ایجنٹ اس کے کاروبار کو دیکھتا تھا۔اسی وجہ سے وہ الجیر سے باہر رہ کر آزاد زندگی گزار سکتا تھا۔اور گزار رہا تھا۔کاروبار اچھا تھا۔سرمایہ کاری سے اس کو اچھا منافع مل جاتا تھا۔کبھی کبھی کے نقصان کو وہ بغیر کسی افسوس کے برداشت کرلیتا تھا۔یہ فائدہ اس کو اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے تھا۔خود مختاری صرف چند بھروسے کے الفاظ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔مرساں نے اب اپنی قسمت کو لوسی کی قسمت سے وابستہ کرلیا تھا۔

وہ بالکل اکیلی تھی۔اس کے کوئی عزیز واقارب نہیں تھے۔تنہا رہتی تھی اور ایک کوئلہ کی کمپنی میں سیکریٹری تھی۔کم کھاتی تھی مگر پھلوں کی شوقین تھی اور برابر اپنے جسم کو متوازن رکھنے کے لئے سوڈیلش کثرت کرتی۔مرساں اس کو پڑھنے کے لئے کتابیں دیتا تھا جو وہ کچھ کہے بنا واپس کردیتی تھی۔اگر مرساں پوچھتا تب وہ کہتی کہ ہاں مجھے کتاب اچھی لگی یا پھر یہ کہ پسند نہیں آئی۔دردناک تھی۔جس دن اس نے الجیر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔اس نے لوسی کو رائے دی کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور چاہے تو الجیر میں اپنا اپارٹمنٹ بھی رکھے اور نوکری چھوڑ دے۔اس نے لوسی کو یہ دعوت پورے بھروسے سے دیا تھا۔اس طرح کہ اس سے لوسی کے وقار کو کسی طرح بھی ٹھیس نہ پہنچے۔وہ اکثر اپنے ذہن کے بجائے اپنے دل سے سوچتی تھی۔وہ راضی ہوگئی۔مرساں نے اپنی دعوت میں مزید اضافہ کی کہ اگر وہ یعنی لوسی چاہے تو مرساں اس سے شادی کرسکتا ہے۔مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں۔جیسا تم چاہو لوسی نے سادہ سا جواب دیا۔

ایک ہفتہ کے بعد انہوں نے شادی کرلی۔مرساں نے لوسی کو شہر چھوڑنے کے لئے راضی کرلیا۔اسی دوران لوسی نے نارنجی رنگ کی ایک چھوٹی سی کشتی نیلگوں سمندر پر ترانے کے لئے خریدی۔

مرساں نے جلدی سے گاڑی کے پہیے کو گھمایا تاکہ اچانک سڑک پر آجانے والی مرغی کو بچاسکے۔وہ کیتھرین سے اپنی بات چیت پر غور کررہا تھا۔جس دن اس گھر چھوڑا تھا اس رات اس نے اکیلے ہوٹل میں گزاری۔یہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ صبح بارش ہوئی تھی لہٰذا پورا ساحلی علاقہ مرطوب ہورہا تھا۔اور آسمان مکمل سیاہ۔مرساں نے اپنا سامان باندھا۔اپنی نئی زندگی کے متعلق کی سوچ پر خوش تھا۔

مگر کیتھرین نے پوچھا اگر تم یہاں خوش ہو تو پھر جا کیوں رہے ہو۔مجھے ڈر ہے پیاری کیتھرین کہ یہاں کی محبت میرے قدم روک لے گی اور میں اپنی سوچی ہوئی خوشی نہ پاسکوں گا۔کاوچ پر اپنے آپ کو سکیڑے ہوئے لیٹے لیٹے کیتھرین نے مرساں کو گھورا اور کہا کتنے لوگ اپنی زندگی کو خواہ مخواہ مصیبت میں مبتلا کردیتے ہیں اور اپنے لئے مشکلات پیدا کرلیتے ہیں۔

مگر میرا معاملہ الگ ہے۔میرے لئے زندگی آسان ہے۔مرساں نے یہ خیال خیالی دنیا میں کھوتے ہوئے کہے۔وہ کیتھرین سے براہِ راست مخاطب نہیں تھا۔کیا تمہیں میری بھی پرواہ نہیں یہ کہتے ہوئے کیتھرین پھوٹ پڑی۔کیتھرین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے مرساں نے

کہا۔ پیاری کیتھرین مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔تم بہت ہمت والی ہو۔تمہارے اندر بہت خوبیاں ہیں۔ پرخلوص سچائی سے تمہارا دل منور ہے۔تمہاری دنیاوی خوشی کسی مرد کی محتاج نہیں۔ جو اکثر عورتوں کی ہوتی ہے۔تم اپنی خودی میں اپنی خوشی تلاش کرو۔ میں شکایت نہیں کر رہی ہوں مرساں۔کیتھرین نے نرمی سے یہ الفاظ کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ مرساں کے کندھوں پر رکھ دیے۔اور محبت بھرے فکر انگیز انداز سے بولی کہ مجھے تمہاری فکر ہے۔تم اپنا خیال رکھنا۔مرساں کو احساس ہوا کہ کتنی آسانی سے اس کے عزائم متزلزل ہو سکتے ہیں۔مگر اس نے اپنے دل کو کڑا رکھا۔اور کیتھرین سے کہا تمہیں اس وقت مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گیا۔اب اس کے ذہن میں کوئی جھجک نہیں تھی۔اب اسے اپنی زندگی جینو میں نظر آ رہی تھی۔ہریالی اور راستہ۔محبت بغیر کسی امید یا ناامیدی کے۔ایک ایسی زندگی کا تصور جہاں حسن و شباب ہو شراب و خمار ہو۔ پھول ہوں خوشبو ہو۔غیر ارادی طور پر اس مڑ کر دیکھا اور کیتھرین بے حس و حرکت خاموش کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد مرساں جینو کے آس پاس میں تھا۔رات کے آخری بنفشی سائے پہاڑی ڈھلان سے سمندر میں اترتے دکھائی دے رہے تھے۔اور پہاڑی کی چوٹی سورج کی تیز روشنی سے منور ہو رہی تھی۔سرخ اور زرد۔جو مکان مرساں نے خریدہ تھا وہ ڈھلوان کے آخری سرے پر تھا۔وہاں سے سمندر تقریباً سو گز کے فاصلہ پر آفتابی کرنوں سے سونے کے مانند چمک رہا تھا۔

یہ ایک ایک منزلہ عمارت تھی۔اوپر صرف ایک کمرہ پر مشتمل۔مگر یہ کشادہ کمرہ اپنی کھڑکی سے سامنے باغیچہ اور کھلے سمندر کا نظارہ پیش کرتا تھا۔مرساں جلدی سے وہاں پہنچا۔گھر کی چار دیواری میں گلاب کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ نچلی منزل پر ایک کمرہ کی کھڑکی دوسری جانب اس علاقے کی پہاڑوی اطراف کا نظارہ دکھاری تھی۔جس کی ترائی میں پھلوں کے باغات تھے۔دور سمندر میں جہاز دکھائی دے رہے تھے۔

اب وہ وہاں تھا جہاں اسے رہنا تھا۔اسے کوئی شک نہیں تھا کیونکہ جگہ ہی اتنی خوبصورت اور دل کو لبھانے والی تھی۔آخر اس نے یہ جگہ کیوں پسند کی تھی مکان کیوں خریدا تھا۔

مگر وہ سکون اور تسکین جو وہ چاہتا تھا اس نے اُسے مایوس کیا وہ سکون جو وہ چاہتا تھا اس کی

تنہائی اب اس کو کاٹنے لگی تھی کچھ ہی فاصلے پر علاقے کا گاؤں موجود تھا۔وہ گھر سے باہر آ کر ڈھلان پر سے نیچے اترنے لگا۔وہ سڑک جو سمندر کی طرف جاتی تھی اس پر جا کر اُس نے خلیج کے پار ٹیپاسا کے آثار قدیمہ کے کھنڈرات دیکھے۔

اُسے گھر کو ترتیب دینا تھا۔اپنی زندگی کو منظم کر رہا تھا۔ پہلا دن جلدی گزر گیا۔اُس نے کچھ دیواروں پر سفیدی کی الجیر سے لائی ہوئیں تصاویر لگائیں۔کچھ بجلی کے سوئچ بدلے بلب لگائے۔سارے دن کی مصروفیت کے درمیاں اُس نے بازار میں جا کر وہاں کے کیفے میں لنچ کیا۔شام ہونے سے پہلے وہ سمندر میں ڈبکی لگانے بھی چلا گیا۔مگر پھر دیر تک تیرتا رہا اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو چکی تھی۔ وہ گھر واپس آیا۔اب وہ اس چھوٹی سی آبادی کے لوگوں جانے پہنچانے لگا تھا۔اتوار کو کچھ نوجوان اس کے گھر آ جاتے۔ وہ کھانے کی ٹیبل پر پنگ پانگ کھیلتے۔اس کی گاؤں کے ڈاکٹر برناؤ سے بھی ملاقات ہو چکی تھی اب تک وہ گاؤں کے اجنبی لوگوں سے خوب گھل مل چکا تھا۔

کیفے کے مالک سے بھی دوستی ہو چکی تھی۔مگر اب اُسے رات کی تنہائی کھلنے لگی تھی۔مگر پھر وہ اپنے آپ کو تسلی دیتا کہ یہی تنہائی تو تمہاری خواہش تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس خاموش زندگی کا عادی بنا لینا چاہتا تھا۔وہ شام کو اپنی کھڑکی سے حسین دوشیزاؤں کو سمندر کنارے ٹہلتے دیکھتا تھا۔وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مست خراماں رہتیں وہ کھڑکی سے ہٹ جاتا اپنے خیالات بدلتا۔اُس نے اپنی زندگی کے روز و شب کو فی الوقت ایک ڈھنگ پر ڈھال لیا تھا۔رات کے کھانے کے بعد وہ بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا۔رات دس بجے تک اپنی سوچوں سے تھک کر اُسے نیند آنے لگتی اور وہ بستر پر دراز ہو جاتا۔دوسری صبح وہ دیر سے اٹھا۔تقریباً دس بجے۔اپنا ناشتہ خود تیار کیا اور شیو اور نہانے سے پہلے ہی ناشتہ کر لیا۔پھر بے مقصد کمرے میں چکر لگاتا رہا۔اُس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ بجلی کی مرمت کا کام نکال بیٹھا۔اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ کیفے والا اس کے لئے لنچ لے کر آ گیا تھا۔حالانکہ اُسے کوئی خاص بھوک نہیں تھی پھر بھی وہ اُسی وقت کھانے بیٹھ گیا کہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔کھانا کھا کر وہ نیچے کے کمرے میں آ گیا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔آنکھ کھلنے پر اُسے الجھن ہوئی کہ وہ سو گیا تھا۔شام کے چار بج چکے تھے۔اس نے اب شیو کیا، نہایا۔کپڑے بدلے۔تازہ دم ہو کر وہ خط لکھنے بیٹھ گیا اُس نے دو خط لکھے ایک لوسی کو دوسرے تین لڑکیوں یعنی روز۔ کلیری اور کیتھرین کو۔ دیر ہو چکی تھی۔مگر شام کا ڈاک گھر

کھلا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ خط پوسٹ کرتے چلا گیا اور بغیر کسی سے ملے واپس آ گیا۔ کچھ دیر ٹیرس پر بیٹھا سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ رات کا کھانا کھا کر اُس نے کچھ پڑھنے کے لئے ایک کتاب اٹھائی مگر چند جملے ہی پڑھنے کے بعد اُسے گہری نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا دوسری صبح وہ پھر دیر سے اٹھا۔ زندگی میں تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہوگئی تھی۔ آخر بے زار ہو کر اُس نے لوسی کو بلانے کا خط لکھ ہی ڈالا۔ خط تو اُس نے لکھا مگر اُسے شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ جو اس نے سوچا تھا اس پر قائم نہ رہ سکا۔ مگر جب لوسی اس کے پاس آ گئی تو وہ سب کچھ بھول کر پھر اپنی ڈگر پر آ گیا۔ وہی آرام دے اور عیاشی کی زندگی۔ مگر اب مرساں کی زندگی میں ہزار جتن کے باوجود ٹھہراؤ کی جگہ جو اس کی خواہش تھی ایک بے کلی سی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ چند دنوں کے بعد ہی لوسی نے اُسے بور کر دیا۔ جبکہ لوسی اب اُسی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ وہ اس وقت رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ مرساں لوسی کی طرف بالکل دھیان نہیں دے رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد لوسی نے مایوس کن انداز سے کہا ''تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔'' مرساں نے اب نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر میری پیاری میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اسی لئے تو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ مرساں اٹھ کر کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوسی کو اُس نے کبھی بھی دل سے نہیں چاہا تم ایک خوبصورت لڑکی ہو لوسی اس سے زیادہ میں تمہارے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔ ہمارے لئے یہ ہی بہت ہے۔ لوسی اُس وقت چھری کی نوک سے میز پوش کو کھرچ رہی تھی۔ یہ اُس کی اس وقت کی ذہنی کیفیت کا مظہر تھا۔ مرساں اٹھ کر لوسی کے قریب آیا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ یقین کرو لوسی دنیا میں بڑے سے بڑا دکھ۔ بڑے سے بڑا پچھتاوا۔ اور حسین یادیں بہت کچھ بھلایا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ عشق کی حد تک محبت کو بھی۔ اور یہ ہی زندگی کا غم ہے اور ساتھ ہی یہ ہی زندگی کا کمال ہے۔ حیرت انگیز بات ہے۔ یہ زندگی کو برتنے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ اچھا ہے کہ انسان کی زندگی محبت میں گزارے۔ بہر حال یہ انسان کے غم کا مداوا ہے۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تم میری باتوں کو سمجھ بھی رہی ہو یا نہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ لوسی نے کہا میں خوش رہوں گا مجھے خوش رہنا ہے مرساں نے جوش اور جذبے سے کہا۔ آج کی رات اس سمندر کے کنارے اس جسم کے ساتھ جیسے ہی چھوڑ رہا ہوں میں خوش ہوں۔ لوسی خاموش رہی۔ پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولی کم از کم تم

میری دوستی کا احساس رکھتے ہو۔ کیا نہیں۔

مرساں نے جھک کر اس کے کندھے کو چوما۔ دوستی ہاں بالکل جیسے میری شب باشی سے دوستی ہے۔ تو تم میری نگاہ کے لئے باعث مسرت ہو۔ اور تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میرے دل میں اس خوشی کی کیا اہمیت ہے۔ دوسرے روز لوسی چلی گئی۔ پھر اس کے جانے کے بعد مرساں بھی اپنی سوچ کا قائم نہ رہ سکا اور اس نے الجیر کا رخ کیا۔

وہ سب سے پہلے اپنے اُس ''دنیا سے بلند'' والے گھر پہنچا۔ پھر وہ اپنے پرانے پڑوسیوں کے پاس پہنچا۔ اس کا فلیٹ ایک کیفے کے مالک نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ اُس نے اسلحہ ساز کارڈونا کے متعلق پوچھا مگر کسی کو اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ کسی نے مرساں کو بتایا کہ شاید وہ کام کی تلاش میں پیرس چلا گیا ہے۔ مرساں اُس ریسٹورنٹ میں گیا جہاں وہ کبھی کھانا کھانے جاتا تھا۔ اب سیلٹی بوڑھا ہو چلا تھا۔ رینی ابھی بھی وہاں موجود تھا۔ اپنے ٹی بی کے مرض میں مبتلا۔ وہ سب پیٹرس مرساں کو دوبارہ اپنے درمیان پا کر خوش تھے۔ مرساں ان کی دوستی کے اظہار سے خوش ہوا۔ ارے مرساں سیلٹی نے کہا تم بالکل نہیں بدلے۔ ویسے کے ویسے ہی ہو۔ مرساں لوگوں کے اس انداز گفتگو سے متاثر تھا کہ حالانکہ وہ خود وقت کی رفتار کے ساتھ اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتے ہیں مگر دوسرے کو خوش رکھنے کے لئے انہیں خوش کن انداز میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اُس کے پرانے دوست اس کو ویسا ہی سمجھ رہے تھے کہ جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ حالانکہ اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ پہلے والا مرساں نہیں رہا تھا۔

وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلا تو اس کی نظر مارتھا پر پڑی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ مارتھا کو بھول چکا تھا مگر اُس دیکھ کر اُس کے دل میں مارتھا سے ملنے کی خواہش جاگ گی۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی کسی دیوی کی جھلک قائم تھی۔ اس کے اندر ایک مبہم سی دلچسپی پیدا ہوگئی وہ اس کے ساتھ جا ملا۔ اور مرساں تم۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ کہاں ہو تم۔ کہیں بھی نہیں بس اب میں دیہاتی ہو گیا ہوں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں نے ہمیشہ گاؤں میں رہنے کو سوچا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو۔ میں تو تم سے بالکل ناراض نہیں۔ مرساں نے ہنستے ہوئے کہا ہاں دل کو بہلانے کے لئے یہ خیال اچھا ہے۔ اس پر مارتھا نے ایک مختلف لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ہنسنے کی کوشش مت کرو مجھے معلوم تھا تم ایک دن واپس آ گے اور

سب کچھ ایسا ہی ہوگا۔ تب تم عجیب شخص تھے اور میں ایک انجان لڑکی۔ تم مجھے ہمیشہ ایسا ہی کہا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے میں تمہاری حرکتوں پر ناراض تھی مگر میں نے سوچا چلو تم خوش رہو۔ مگر پھر میں تمہارے ساتھ تعلقات پر افسوس کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھی۔ مرساں نے تعجب سے مارتھا کو دیکھا پھر اُسے خیال آیا کہ مارتھا ہمیشہ اس کے لئے مہربان رہی۔ اُس نے اُسے اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ قبول کرلیا تھا۔ اور اس کی تنہائی کی ساتھی بن گئی تھی۔ مگر وہ اس کے ساتھ پرخلوص نہیں تھا۔ وہ ایک عرصہ کی ملاقات کے بعد باتیں کررہے تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ پانی کے قطروں سے بھیگے ہوئے مارتھا کے چہرے پر اچانک مرساں نے ایک گہری سنجیدگی محسوس کی۔ خلوص اور محبت کی۔ گئے دنوں کی بات ہوتی تو وہ اس کے اس رخ کو صرف وقتی دلچسپی سمجھتا مگر اب وہ بھی سنجیدہ تھا اُس نے بھی پورے خلوص سے کہا کہ مارتھا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ بتاؤ اگر میں تمہارے لئے کچھ کرسکوں۔ نہیں کوئی ضرورت نہیں میں ابھی جوان ہوں اپنی دیکھ بھال کرسکتی ہوں۔ مارتھا کے اس سپاٹ سے جواب سے مرساں کو بہت مایوسی ہوئی۔ اس کی سوچ کو دھکا لگا۔ مرساں نے مارتھا کو اس کے گھر کے قریب چھوڑا۔ مارتھا نے اپنی چھتری کھولتے ہوئے کہا کہ میں امید رکھتی ہوں کہ ہم پھر ملیں گے۔ ہاں۔ مرساں نے مختصر سا جواب دیا۔ مارتھا نے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اپنی چھتری بند کی۔ مرساں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مسکرایا۔ اچھا پھر ملیں گے کہہ کر مارتھا نے اچانک مرساں کے دونوں گالوں پر بوسہ دیا اور اوپر سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ مرساں بارش میں کھڑا مارتھا کے ناک کی ٹھنڈک اور بوسوں کی گرمی اپنے گالوں پر محسوس کررہا تھا۔

پھر وہ لوسی کی تلاش میں نکلا۔ وہ مل گئی۔ اس کے ساتھ وہ بازار میں گھومتا رہا پھر رات اس کے فلیٹ میں بسر کی۔ دوسرے دن دوپہر کو وہ فلیٹ سے نیچے آئے۔ ساحل پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ آسمان پر بگلوں کا غول اڑ رہا تھا۔ موسم قدرے گرم تھا۔ لوگ اسٹیمر پر سوار ہورہے تھے اور دور اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ دیکھنے والے کو اس میں عجب خوشی اور غم کا ملا جلا احساس ہوتا ہے۔ یہ لوگ خوش قسمت ہیں لوسی نے مسافروں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ منہ سے اُس نے ہاں کہا حالانکہ وہ سوچ رہا تھا کہ نہیں کم ازکم اس کو ان کی قسمت پر رشک نہیں۔ انجانے راستے پر جانے میں اک انجانی مسرت کا احساس تو ہوتا ہے مگر ان لوگوں کو جن کی منزل متعین نہیں ہوتی۔ سفر ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہونا چاہئے۔ اس کے کانوں میں زیگریو کی آواز گونجی ''ترکِ

خواہش نہیں بلکہ خواہش خوشی کی یہ ہے مقصدِ زندگی۔'' اُس نے لوسی کے کمر میں اپنے ہاتھ حمائل کردیئے۔ شام میں جب وہ چینوا واپس جارہا تھا تو سمندر اور پہاڑوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے اُسے گہری خاموشی کا احساس ہوا۔ یہ اس کے اندر کی خاموشی تھی۔ اپنی نئی زندگی کے آغاز پر اُسے اپنا ماضی یاد تھا۔ اب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا وہ اس بات کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اپنے بے مقصد فضول وقت کے گزرنے کا اُسے پچھتاوا تھا۔ اب اُسے صحیح اور سوچے سمجھے راستوں کو اپنانا تھا۔ موڑ درموڑ راستوں پر سفر کرتے ہوئے ماضی کے پچھتاوے کے ساتھ اُس نے گویا حقیقی سچائی کو پالیا تھا۔ اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کو اپنانے پر۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا گویا اس کو اپنی نئی سوچ پر عمل کرنے کی جلدی تھی۔ اب وہ زندگی کو اس دھارے پر ڈال دے گا جہاں وہ شعوری کوشش کے بغیر وقت اور تقاضے زندگی سے ہم آہنگ ہوجائے گا۔

دوسرے روز وہ جلدی اٹھ گیا۔ ڈھلان سے اتر کر ساحلِ سمندر پر پہنچا۔ کھلا آسمان تھا۔ پرندے غوطہ زنِ آب تھے۔ ابھرتے سورج کی روشنی کی کرنیں سمندر کے پانی کو پگھلے ہوئے سونے میں تبدیل کررہی تھیں۔ نہانے کے بعد اُسے بڑی تازگی محسوس ہورہی تھی اب وہ پورے دن کی ہر مشقت کے لئے تیار تھا۔ وہ ہر روز اب اپنی اس عادت پر عمل کرتا۔ صبح منہ اندھیرے وہ سمندر کی موجود سے موج مستی کرتا اور اتنا تیرتا کہ تھک جاتا کہ پھر سارا دن اپنے تیرنے کی طاقت اور اس کی تھکاوٹ کے درمیاں وہ آرام دہ سکون محسوس کرتا تھا۔ مگر کبھی کبھی وقت گزارنا اس کے لئے مشکل بھی ہوجاتا کیونکہ ابھی تک اس کی بہت سے عادتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ کبھی وہ اپنی کلائی کی گھڑی کی منٹ کی لمبی سوئی پر نظر جما کر بیٹھ جاتا تو اُسے پانچ منٹ تک سوئی کا سفر بہت لمبا محسوس ہوتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وقت کا عمل بھی کیا عمل ہے کہ بے عمل میں بھی عمل ہے یعنی زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔ اب وہ کبھی کبھی بھری دوپہریا میں بھی باہر چکر کاٹنے نکل جانا سیکھ چکا تھا۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ دور تلک چلا جاتا حتیٰ کہ وہ ٹیپاسا کے کھنڈرات تک پہنچ جاتا۔ وہ اکثر جھاڑیوں کے درمیان لیٹ جاتا۔ کھنڈرات میں آثار قدیمہ کی عمارت کے گرم پتھروں کو چھو کر محسوس کرتا کہ کیا شاندار زمانہ رہا ہوگا جب زمانہ ان عمارات پر مہربان رہا ہوگا۔ ان بے جان پتھروں کی عمارات میں بھی زندگی رواں دواں رہی ہوگی۔

جیسا کہ ایک وقت آتا ہے کہ ایک مصور کو اپنی تصویر کشی کو کہیں نہ کہیں چھوڑنی پڑتی ہے۔ ایک

سنگ تراش کو اپنے بت کو اسی طرح زندگی کی خوشی کے لئے بے توجہی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جس کو مرساں پار کر رہا تھا۔

اتوار کے روز مرساں بوڑھے مچھیرے پریز کے ساتھ تاش کھیلا کرتا تھا۔ مچھیرے کا ایک ہاتھ کہنی سے کٹا ہوا تھا۔ وہ ایک مخصوص انداز سے کھیلتا تھا۔ وہ بوڑھے مچھیرے کے ساتھ مچھلی کے شکار پر بھی نکل جاتا۔ سارا سارا دن وہ مچھلی پکڑتے۔ شام بوڑھا مچھیرا انہیں انہیں کی چربی میں تلتا اور دونوں مزے سے کھاتے۔ بوڑھا کبھی کسی چھوٹی مچھلی کو تڑپتا دیکھ کر مچھلی کو دوبارہ پانی میں پھینک دیتا اور کہتا جا اپنی ماں کے پاس چلی جا۔ بوڑھا مچھیرا بہت کم گو تھا۔ اُس کم گوئی میں بھی اس کی حرکتوں سے مرساں بہت کچھ سمجھ لیتا تھا۔ وہ زندگی کی گہری سچائی کو پا رہا تھا۔ اس نے اپنے لئے ایک جنت تخلیق کر لی تھی۔ ایسی جنت جو ایک حیوان یا پھر بہت زیادہ ذہین شخص اپنے لئے پیدا کر لیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان مکاں سے لامکاں کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کا انسانی عمل ختم ہو جاتا ہے اور بندہ ابدی اور حقیقی خوشی کے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ مرساں ابھی اپنی منزل سے کوسوں دور تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ شکر ہے کہ گاؤں کی زندگی میں پوری دلچسپی رکھتے تھے اور لوگوں سے گھل مل کر خوش ہوتے تھے۔ اپنی چھوٹی موٹی تکلیفوں کے لئے وہ ڈاکٹر برنارڈ کے پاس اکثر جاتا رہتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملکر خوش ہوتے تھے۔ ڈاکٹر عمومی طور پر ایک خاموش طبع شخص تھے۔ کبھی کبھی طنز آمیز مزاح کرنے کی کوشش کرتے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ بہت عرصہ تک چین اور ہند میں پریکٹس کرتے رہے تھے۔ اور اب وہاں سے ریٹائر ہو کر یہاں الجیر میں آبسے تھے۔ یہاں بہت عرصہ تک وہ اپنی بیوی کے ساتھ پرسکون زندگی گزار چکے تھے۔ وہ چینی تھی۔ الجیر کی زبان سے ناآشنا مگر مغربی لباس زیب تن کرتی تھی۔ وہ گاؤں والوں کو پسند کرتی تھی اور اسی طرح مقامی لوگ بھی اُسے پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ اور مرساں ایک ساتھ وہاں گھوما کرتے تھے۔ علاقے کے لوگوں نے محلّہ کمیٹی بنائی ہوئی تھی جو تفریح وطبا اور دیگر سماجی کاموں کے لئے تھی۔ ڈاکٹر برنارڈ اس کمیٹی کے اہم رکن تھے انہوں نے مرساں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ 14 جولائی کو وہ لوگ رنگیں بازو بندھ کے ساتھ سڑک پر مارچ کرتے تھے۔ کمیٹی کے الیکشن میں مرساں کو حصہ لینے کے لئے کہا گیا مگر وہ اس لالچ سے دور رہا کیونکہ وہ میر کو جانتا تھا جو پچھلے کئی سالوں سے کمیٹی کی صدارت کر رہا تھا اور اپنے آپ کو نپولین بونا پارٹ سمجھنے لگا تھا۔ وہ خاصا دولت مند تھا۔ اس کے انگور کے باغات

تھے۔ اپنی رہائش کے لئے میر نے یونانی ساخت کا ایک خوبصورت بڑا سا محل نما گھر بنوایا ہوا تھا۔ اس نے اپنا یہ مکان بڑے فخریہ طور پر مرساں کو دکھایا دو منزلہ یہ عمارت چاروطرف سے کھلے صحن اور احاطہ سے گھرا ہوا تھا۔ میر نے پیسہ خرچ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ گھر میں لفٹ بھی موجود تھی۔ میر نے ڈاکٹر برنارڈ اور مرساں سے اس پر سوار ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر نے مکھن لگایا یہ کہہ کر کہ وہ یہ لفٹ کتنی سبک رفتار ہے۔ مرساں بھی میر کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا۔ ڈاکٹر اور مرساں دونوں نے میر کو میر بنے رہنے کی درخواست کی۔

موسم بہار میں وہ علاقہ پہاڑی اور سمندر کے درمیاں اپنی لال کھپریل والے خوبصورت گھروں کے درمیاں پھولوں سے لد جاتا۔ گلاب اور دوسرے خوبصورت خوشبودار پھولوں کی موجودگی میں رنگ برنگے پرندے اور بھنورے منڈلاتے رہتے تھے۔ مرساں اپنی بالکونی سے نظارہ کیا کرتا تھا۔ کیا پرسکون ماحول لگتا تھا مگر مقامی تاریخ اس بات کی گواہ تھی کہ ماضی میں یہاں موریل اور بنکو کے درمیاں مسلسل مقابلہ جاری رہا تھا۔ یہ دونوں دولت مند ہسپانوی زمیندار تھے۔ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں ایک بدترین دشمنی نیں مبتلا تھے۔ جب ان میں سے کوئی بہت شاندار اور مہنگی کار خریدا تو دوسرا وہی گاڑی خرید کر اس میں چاندی کے ہینڈل لگا لیتا۔ موریل اس طرح کے مقابلے میں بہت ذہین تھا۔ وہ پورے علاقے ہسپانوی بادشاہ کہلاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بنکو سے جیت جاتا تھا جو اتنی عقلمندی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا جب جنگ کے دوران میں بنکو نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں فرانک اپنی طرف سے چندا دیا تو موریل نے اعلان کیا کہ وہ اس سے بڑھ کر جنگ کی کامیابی کے قربانی دیں گے۔ اس نے اپنے جوان بیٹے کو جنگ کے لئے رضا کار تیار کرنے کے لئے اس کو کام پر لگا دیا۔ یہ 1965ء کی بات ہے۔ بنکو کو باالخیر الجیر سے ایک علاقائی نسل کے بگائی لوگوں نے مار بھگایا۔ اس کے چند ہفتوں کے بعد موریل نے ایک ہوائی جہاز خرید لیا۔ وہ جہاز بھی یادگار کے طور پر ہینگر میں کھڑا ہے اور اتوار کے اتوار وہ لوگوں کو دکھایا جاتا ہے۔ بنکو موریل سے جل کر اُسے ننگا بھکاری کیا کرتا تھا اور جواب میں موریل بنکو کو نہ جانے کیوں کس لحاظ سے ''چونے کا بھٹہ'' کہہ کر چڑھاتا تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ مرساں کو موریل سے ملوانے لے گیا۔ جس نے ان لوگوں کو اپنے بڑے فارم پر خوش آمدید کہا۔ فارم پھولوں اور انگور کی بیلوں سے لدا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر فارم پر رہے۔ اس دوران انہوں نے ہوائی جہاز بھی ہینگر میں کھڑے دیکھا۔ واپسی پر ڈاکٹر اور مرساں موریل کے

بارے میں باتیں کرتے رہے موریل ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق ایک شاعر بھی تھا مگر مرساں کا خیال تھا کہ وہ ڈوبتے ہوئے رومن ایمپائر کے زمانے میں ہوتا تو ایک اچھا بادشاہ ثابت ہوتا یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

کچھ دنوں کے بعد لوسی جی نوا چند دنوں کے لئے آئی۔ اور پھر چلی گئی۔ ایک اتوار کو روز۔ کلیری اور کیتھرین بھی مرساں کے پاس آئیں جیسا کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ مگر اب مرساں ذہنی طور پر ایک مختلف شخص تھا پھر بھی وہ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے ڈاکٹر برنارڈ کو بھی بس اسٹاپ پر لے گیا تھا جہاں ایک بڑی پیلی بس نے ان لوگوں کو اتارا تھا۔ یہ ایک خوشگوار دن تھا لوگ رنگ برنگے لباس میں ملبوس خوش خوش گھوم پھر رہے تھے۔ کیتھرین کی دعوت پر انہوں نے کیفے میں کھایا پیا۔ لڑکیوں کو یہ سہانی زندگی اچھی لگی۔ جب وہ رخصت ہو رہے تھیں تو انہیں دوسری جانب دلکش موسیقی کی ترنگ سنائی دی۔ گانے گائے جا رہے تھے۔ برنارڈ نے بتایا کہ یہ کوئی جمناسٹک کرنے والوں کا گروپ ہے جو گانے بجانے میں بھی خوب اچھل کود مچاتا ہے۔ پھر تقریباً بیس کی تعداد میں وہ موسیقار نمودار ہوئے جو پھونکنے والے آلہ موسیقی بجاتے ہوئے کیفے کی جانب آئے۔ اس دوران ان کے پیچھے موریل ایک ہیٹ سر پر رکھے اور اپنے کو پنکھا جھلتے ہوئے ہوئے سامنے آیا۔ دراصل یہ ہنگامہ موسیقی اُسی کی طرف سے اُس اداس بقول اس کے شہر کے لئے ایک تحفہ تھا۔ کیفے کے اندر آ کر اس یہ بلند آواز اعلان کیا لوگوں گانے بجانے کے مزے لوٹو۔

ان کے جانے کے بعد لڑکیوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ پھر وہ مرساں کے گھر واپس آئیں۔ جہاں خاموشی اور سکون تھا۔ کیتھرین نے ٹیرس پر غسلِ آفتابی لینے کا فیصلہ کیا۔ مرساں برنارڈ کو چھوڑنے اس کے گھر تک گیا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ ڈاکٹر نے مرساں کی زندگی پر غور کیا۔ اس سے پہلے ان دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو ہم راز نہیں بنایا تھا۔ مرساں سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے اور ڈاکٹر مرساں کی زندگی سمجھ نہیں پایا تھا اور دھوکے میں تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

دوسرے روز لڑکیوں نے پہاڑیوں چڑھنے کا پروگرام بنایا۔ وہ بہت صبح اٹھیں اس کے سامنے سارا دن دھوپ اور تھکاوٹ کا موجود تھا۔

صبح ہی صبح وہ پہلے عمودی چٹان پر چڑھے۔ روز اور کلیری آگے تھیں کیتھرین اور مرساں

ان کے پیچھے۔ وہ خاموشی سے بلندی پر پہنچتے گئے۔ نیچے گہرا سنہرا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ مرساں نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کا تعلق پہاڑوں سے ہو گویا وہ دراصل کوہستانی ہے۔ وہ پہاڑیاں جو زعفران کے پھولوں سے گھری ہوئی ہوں۔ روز اور کلیری تھک چکی تھیں اور ان کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ مگر کیتھرین مرساں کے ساتھ اوپر چڑھتی رہی اور کچھ دیر تک وہ لوگ روز اور کلیری کی نظروں سے دور ہو چکے تھے۔ تم ٹھیک تو ہو۔ تھکی تو نہیں مرساں نے کیتھرین سے پوچھا۔ نہیں سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ سورج اوپر آ چکا تھا۔ مرساں نے اپنی قمیض اتار دی اور ننگے بدن ہو گیا۔ پسینہ اس کے جسم کو تر کر رہا تھا۔ وہ اب سایئے دار جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ نیچے گھاس آ گئی ہوئی تھی جو گیلی تھی۔ یہ جگہ مقابلتاً ٹھنڈی تھی۔ کیتھرین گھاس پر لیٹ گئی۔ قریب ہی ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ انہوں کچھ پانی پیا اور ایک دوسرے پر ٹھنڈا پانی اچھالا۔ وہ کیتھرین کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اب جبکہ ہم اکیلے ہیں تو مرساں مجھے بتاؤ کیا تم خوش ہو۔ وہ مسکرایا۔ ہاں مگر میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی تھی بے شک تم چاہو تو جواب نہ دو کہ اس نے کچھ ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو۔ مرساں نے ہنستے ہوئے کہا یہ کوئی ضروری تو نہیں۔ اس نے کیتھرین کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور اسے ہلایا۔ پھر چشمہ کا پانی اس کے اوپر چھڑکا۔ تم یہ سوچنے میں غلطی پر ہو کہ تمہیں انتخاب کرنا ہے۔ تمہیں وہ کرنا ہے جو تم کرنا چاہتی ہو۔ اور یہ کہ خوشی کی کوئی شرطیں ہوتی ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ یہ کہ خوش رہنے کی خواہش ہونی چاہئے۔ ہر وقت شعوری طور پر خوشی کی تلاش۔ باقی سب باتیں مثلاً عورت۔ تن۔ کامیابی کچھ بھی نہیں سوائے بہانہ کے۔ زندگی ایک کینوس ہے جو ہمارے نقش و نگار کی منتظر ہے۔ میرے لئے جو بات اہم ہے وہ یہ کہ خوشی کا بھی ایک معیار ہونا چاہئے۔ میں یہ خوشی صرف ایک جدوجہد کے بعد حاصل کر سکتا ہوں۔ یہ سوال کہ کیا میں خوش ہوں اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ اگر مجھے اپنی زندگی دوبارہ گزارنی ہو یا اس کا موقعہ ملے تو میں اپنی دوسری زندگی بالکل ایسی طرح گزاردوں گا جیسے اب تک کی گزری ہے۔ مجھے شک ہے اگر تم میری بات سمجھ پا رہی ہو۔ ہاں نہیں شاید نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔ کیتھرین نے مایوسانہ جواب دیا۔ مجھے نہیں معلوم تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ اگر میں خوش ہوں تو اپنے بڑے ضمیر کی وجہ سے۔ مجھے اپنی اس یکسوئی اور مطمئن ضمیر کے لئے فرار ہونا پڑا کہ مجھے ان تلخ حقائق کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہاں ایک عام انسانی سوچ کے مطابق میں بے شک خوش ہوں۔

اتنے میں روز اور کلیری آ گئیں اپنے اپنے کندھوں پر بیگ لٹکا لے۔ وہ اب پہاڑی باغات کی طرف جا رہے تھے۔ گہری ہریالی ہر سو موجود تھی۔ پکے ہوئی ناشپاتیاں، زیتون اور دیگر پھل درختوں پر جھول رہے تھے۔ کچھ عربی اپنے گدھوں پر سوار باغات کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ چمکیلی دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ پتھر کا ہر زرہ گرم ہو رہا تھا۔ مرساں ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا اُسے شاید نیند آ گئی تھی کیونکہ وہ اٹھا تو تین بج رہے تھے۔ لڑکیاں کہیں غائب تھیں مگر پھر ان کے ہنسنے کی آواز آئی۔ اب واپس جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ مرساں پہلی مرتبہ تھکاوٹ سے بے ہوش ہوا تھا۔ لڑکیوں کو تشویش ہوئی انہوں مرساں کو کہا یہ جگہ اس کے رہنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہے وہ فرانس چلا جائے۔ یہاں کی مرطوب آب و ہوا شاید میرے لئے بہتر نہ ہو مگر میں یہاں خوش ہوں۔ یہاں کے ماحول سے ہم آہنگ ہوں۔ مگر وہاں تم زیادہ ہم آہنگ زندگی گزار سکو گے۔ کلیری نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ خوشی کے معاملے میں کم اور زیادہ عرصہ کا معاملہ نہیں ہوتا۔ یا انسان خوش رہتا ہے یا ناخوش۔ اور ہاں موت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ موت خوشی کا ایک حادثہ ہے۔ مرساں کے اس فلسفہ کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد روز بولی میں قائل نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ پہاڑیوں سے نیچے آ گئے۔ رات ہو چلی تھی۔ کیتھرین نے مرساں کے لئے ڈاکٹر برنارڈ کو بلا بھیجا۔ مرساں اپنے کمرے میں تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ وہ سمندر کو دیکھ رہا تھا پر آسمان کوئی تارے نہ تھے۔ وہ کمزوری محسوس کر رہا ہے۔ مگر یہ کمزوری اُسے پُراسرار طور پر خوش رکھ رہی تھی۔ اس کا دماغ تفکرات سے عادی تھا۔ اتنے میں برنارڈ نے دروازے پر دستک دی۔ مرساں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ڈاکٹر کو سب کچھ بتا دیگا۔ اس لئے نہیں [illegible] نے یہ بات مخفی رکھی تھی تو صرف اس لئے کہ انسان کچھ حلقوں میں اپنی بات اپنے تک ہی رکھتا ہے تو بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسروں کی رائے بیوقوفانہ سوچ صرف تکلیف پہنچاتی ہیں۔ مگر آج کے ذہنی تھکاوٹ سے بے ہوش ہو جانے پر وہ سب سے کچھ کہہ دینے پر بے چین تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی سنگ تراش اپنے شاہکار کو تراش اور خراش کے بعد آخر کار اسے لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ مراسلاں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ وجہ بولے گا اور بغیر کچھ چھپائے وہ ایسا کرے گا۔ وہ بے صبری سے برنارڈ کا انتظار کر رہا تھا۔

نچلی منزل سے ان لوگوں کی ہنسی مذاق کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُسی لمحہ برنارڈ کمرے میں

داخل ہوا۔ کہو کیا حال ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ ڈاکٹر نے آلہ سے اس کے سینہ کا معائنہ کیا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا جب تک کہ تمہارا ایکس رے نہ لیا جائے۔ بہتر ہے کہ تم دیگر جانچ کے لئے الجیر چلے جاؤ۔ سوچوں گا بعد میں کبھی سہی مرساں نے جواب دیا۔ برنارڈ تشویش والی نگاہوں سے مرساں کو دیکھا اور بولا کچھ نہیں۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگا مجھے خود بھی کبھی بیمار ہونا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے معلوم ہے بیماری کسے کہتے ہیں۔ صحت دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور بیماری ایک لعنت۔ مرساں بے پرواہ رہا۔ وہ اٹھا ایک سگریٹ سلگایا اور ڈاکٹر کو دیا دوسرا اپنے لئے اور ہنستے ہوئے کہا کیا برنارڈ میں تم سے ایک سوال کر سکتا ہوں ضرور کرو۔ تم نے ڈاکٹر یہ جگہ اپنے رہنے کے لئے کیوں پسند کی جبکہ تمہیں ساحل سمندر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سمندر میں تیرنے کا کوئی شوق نہیں۔

ارے بھئی مجھے نہیں معلوم مجھے تو یہاں رہتے ہوئے ایک لمبا عرصہ گزر گیا ہے۔ میں یہاں خوش ہوں۔ کہیں نہ کہیں تو بندے کو بسنا ہے۔ مگر محض جذباتی لگاؤ کہ تحت کسی جگہ رہنا ہمیشہ بہتر نہیں ہوتا۔ ہمیں وہاں رہنا چاہئے جہاں زندگی آسان ہو نہ کہ زبردستی کسی جگہ رہا جائے۔ بہر حال بنیادی مسلہ بقا کا ہے۔ زندگی ہے تو جہان ہے جب میں انڈوچائنا میں تھا تو ہر جگہ گھومتا پھرتا تھا۔ مگر یہاں میں نے اپنے کو محدود کر لیا ہے۔ ٹھیک ہے مرساں نے سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ تمام جذباتی لگاؤ کسی جگہ سے کوئی غلط بات ہے جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ ہاں کبھی کبھی نامعقول ہو سکتا ہے۔ کسی بھی صورت میں مجھے صرف اس تجربے سے دلچسپی ہو سکتی ہے جو وہ نتیجہ دے جو آپ کی خواہش اور امیر کے مطابق ہو۔ برنارڈ نے ہنستے ہوئے کہا ہاں بنا بنایا مقدر۔

تقدیر کا مسلہ میرے لئے ہمیشہ دلچسپ رہا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں وہ اپنی تقدیر خود بنا سکتے ہیں کچھ سمجھتے ہیں کہ وہ بنا بنایا مقدر لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ شاید دونوں صحیح ہیں یا پھر دونوں غلط۔ ہاں شاید ایسا ہی ہے برنارڈ نے باہر جھانکتے ہوئے مرساں سے کہا۔ میں تو تنہا ہوں مگر شاید تم بھی اپنی بیوی اور اپنے دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا ہو۔ مگر اپنی اس تنہا پسند سوچ کے باوجود تم زندگی سے خوش ہو میرے مقابلے میں زیادہ خوش۔ شاید اس لئے کہ میرے لئے زندگی میں خوشی حاصل کرنے کے لئے تیرنا ضروری نہیں ہے۔ زندگی تو ایک نشہ ہے پوری شدد کے ساتھ۔ عورت۔ ایڈونچر۔ دوسرے ممالک کی سیر عمل کچھ نہ کچھ ہوتے رہنا چاہئے۔ زندگی میں گرمجوشی۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی رعنائیوں میں بہت کچھ

ہے صرف قدرت پر قناعت کے علاوہ۔ برنارڈ نے اپنا اسٹسکوپ اپنے بیگ میں ڈالا۔

مرساں نے کہا دراصل تم ایک تصوراتی شخص ہو۔ مگر اس کا اپنا خیال ہے کہ ہر شے لمحوں میں مقید ہے جو پیدائش سے موت تک مقرر ہے۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ تم جیسا کے تمہیں معلوم ہے ایک اچھے تصورات رکھنے والے شخص سے متضاد وہ شخص ہوتا ہے جو عموماً محبت سے محروم ہوتا ہے یہ بات برنارڈ نے قدرے اداسی سے کہی۔ مجھے یقین نہیں مرساں نے برنارڈ کا ہاتھ اپنے ہاتھ دیر تک پکڑے رکھا۔ تمہارے انداز سے سوچنے والا مرساں نے مسکراتے ہوئے کہا یا تو بہت پر اُمید شخص ہوسکتا ہے یا بالکل مایوس۔ یا دونوں۔ خیر چھوڑو۔ مجھے پروا نہیں۔ ہاں مجھے معلوم ہے مرساں نے سنجیدگی سے کہا۔ مگر جب برنارڈ رخصت ہوتے ہوئے دروازے تک پہنچا تو مرساں نے اُسے روکا جیسے کسی کی اشد ضرورت کے تحت۔ ڈاکٹر نے مڑ کر پوچھا ہاں بولو کیا بات ہے۔ کیا تم کسی شخص کی بے عزتی برداشت کرسکتے ہو۔ ہاں کیوں نہیں مگر کن حالات کے تحت۔ بالکل سیدھی سی بات ہے ڈاکٹر نے جواب دیا۔ میں سمجھتا ہوں اُس وقت جب دولت حاصل کرنے کی سعی میں سب کچھ کرنے کو تیار ہو۔ ہاں یہ واقعی بالکل سیدھی سی بات ہے۔ اچھا شب بخیر ڈاکٹر۔ شب بخیر مرساں۔

اکیلے رہ جانے پر مرساں سوچنے لگا کہ اب وہ اس مقام پر آ گیا ہے جہاں کسی کی عزت بے یا بے عزتی سے اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر اُس نے ڈاکٹر کی طبیعت میں اور خیالات میں ہم آہنگی پائی کہ وہ عزت اور بے عزتی میں واقع فرق محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد مرساں کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ یہ ایک غیر اخلاقی مگر ضروری ہے۔ اُس نے اپنی طبیعت سے وہ تلخی دور کرلی تھی جو کسی اچھے شخص کہ اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنی تقدیر کا رونا روتا ہے۔ غربت کا روگ ایک نعمت ہے وہ لعنت جو کسی کے لئے پیدائش سے شروع ہوتی ہے۔ اور موت پر ختم ہوتی ہے۔ اس لعنت کو دور بھاگنے دولت ہتھیار کام کرتی ہے نفرت کی مخالفت نفرت سے نفرت کرنے سے ہوتی ہے۔

دوسری شام لڑکیاں رخصت ہوگئیں۔ جب وہ بس میں سوار ہورہی تھیں۔ تو کیتھرین نے سمندر کی طرف منہ کرکے کہا۔ گڈ بائی سمندر۔ نہ جانے اُس نے ایسا کیوں کہا۔ بس کے روانہ ہونے پر تین مسکراتے چہرے بس کے پچھلے شیشے سے مرساں کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ پیلی بس مرساں کے نظروں سے دور ہوگئی جیسے سورج کی تیز سنہری روشنی نے نگل لیا ہو۔ مرساں سڑک

پر اکیلا کھڑا تھا۔ اُداس جذبات کے ساتھ۔

اب آج وہ صحیح معنوں میں تنہا ہوا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس پر تنہائی کی اُداسی چھائی تھی۔ اُسے یہ تنہائی قبول کرتی تھی۔ آج کے بعد وہ ہر آنے والے دن کا خود مختار ہوگا۔ اس خود مختاری میں ایک تنہائی اور اداسی کا عنصر موجود تھا۔ واپسی پر بجائے سیدھے سڑک پر چلنے کے اُس نے کھیت کھلیان کا راستہ اختیار کیا جو زیتون کے درختوں کے جھنڈ اور پہاڑی ٹیلوں سے ہوتا ہوا اس کے گھر کو جاتا تھا۔ راستے میں اس نے چند زیتون کے پھل درخت سے توڑے۔ الجیر میں یہ بہار کا موسم تھا۔ خوشبو اور محبت کا موسم۔ اس پھل پھول رنگ و بو کے مست کردینے والے موسم کے بعد ایک طویل سرد موسم آنے کو تھا۔ مگر وہ اُس شدید موسم کے لئے تیار تھا۔ بلکہ نہ جانے کیوں اُسے انتظار تھا۔ وہ جس راستے پر چلا جارہا تھا وہ اسے سمندر دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہاں پہاڑوں کے اوپر سرخی مائل دھند چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ پہاڑوں سے نیچے دھوپ چھاؤں کا کھیل ہو رہا تھا۔ مرساں اس دھرتی سے اپنے تعلق کی تلخی کو محسوس کررہا تھا۔

دنیا پر شام کی اداسی چھا رہی تھی۔ وہ ان انجانے راستوں پر زندگی کے آنے والے انجانے راستوں پر چلتا رہے گا۔ جب تک کے اُسے چلنا ہوگا۔ کب تک چلنا ہے یہ فی الوقت قبل از وقت تھا سوچنا۔

اپنے دل کی معصومیت سے مرساں نے حالات کو قبول کیا ہوا تھا۔ آسمان اور اپنی زمین کو قبول کیا ہوا تھا۔ بالکل اُسی جذبہ کے تحت اُسی خواہش کے تحت جس کے تحت اُس نے معصوم دل کے ساتھ زبگریو کو قتل کیا تھا۔

باب ہشتم

جنوری کے مہینہ میں بادام کے درخت پھولوں سے لد جاتے ہیں مارچ میں آڑو اور ناشپاتی اور سیب کے درختوں پر شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ اگلے ماہ دریاؤں میں آبشاروں میں پانی کا بہاؤ بڑھ گیا اور پھر آہستہ آہستہ اپنی پہلی حالت میں واپس آ گیا۔ مئی کے شروع میں جوار باجرہ کی فصل کی کٹائی ہوئی۔ خوابی ان دنوں پک رہی تھی۔ جون کے ماہ میں ناشپاتی ایک بڑی فصل ہوتی ہے۔ پھر گرمی کی شدت بڑھی۔ جھیل دریا خشک ہونے لگے۔ مگر ادھر کھیت کھیلان میں کپاس کی کھیتی تیار تھی۔ خشک گرم ہوا چل پڑی تھی۔ جنگلوں میں خشک جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ پھر اچانک رُت بدلہ۔ جلدی ہی انگوروں کی فصل ختم ہوگئی۔ ستمبر اور اکتوبر کی بارشوں نے تپتی دھرتی کی پیاس بجھائی۔ گرمی کے ختم ہوتے ہی نئی بو آئی شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ندی نالے پھر پانی سے بھر گئے جب بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سال کے آخر میں چند کھیتوں میں گندم کے پو پھوٹ رہے تھے۔ دوسرے کھیتوں میں دہقانوں نے ہل چلانے شروع کر دیئے تھے۔ کچھ ہفتوں کے بعد بادام کے درختوں پر پھر سفید پھول نیلے آسمان تلے عجیب نظارہ پیش کر رہے تھے۔ نیا سال شروع ہوگیا تھا۔ تمباکو کاشت کی گئی۔ انگور کی بیلیں لگائی گئیں نئے درخت اگائے گئے۔ پھولوں کی بھر مار تھی۔ ہر کھانے کی میز پر رس دار کھٹے میٹھے خوشبو دار رنگ دار مزے دار پھلوں کی بھر مار تھی لوگ خوب مزے لے لے کر انجر۔ ناشپاتی اور آڑو کھا رہے تھے مگر اسی دوراں مرساں پہلی مرتبہ صاحب فراش ہوگیا۔ بستر پکڑ لیا سینے کی جاکڑن نے اسے ایک ماہ تک اپنے کمرے میں قید رکھا۔ جب وہ قدرے ٹھیک ہو کر باہر نکلا تو پورا علاقہ پھول دار درختوں سے گھیرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی بھی موسم بہار نے اُسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا۔ اپنی صحت یابی کی خوشی میں وہ رات کافی دیر تک ٹہلتا رہا۔ گھومتے پھرتے وہ دور نکل گیا۔ وہاں جہاں سے ٹپاسا کے کھنڈرات شروع ہوتے تھے۔ ہر سو گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ہوا کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ بلندی پر تھا۔ نیچے

سمندر موجیں مار رہا تھا۔ پورا علاقہ رات کی خاموشی میں چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ساری کائنات کو چاند نے اپنی دودھیا روشنی میں لپیٹ رکھا ہوا۔

انہیں لمحات میں مرساں کو اپنی زندگی سے دوری محسوس ہوئی۔ وہ ہر شے سے لاتعلق سا لگ رہا تھا۔ ماحول سے کٹا ہوا۔ یہ وقت تھا کہ اُسے احساس ہوا جیسے اُسے نروان حاصل ہوگیا ہو۔ اُسے اپنے آپ کو کھو کر سب کچھ مل گیا ہو۔ اُسے اب وہ امن اور امان اور سکوں مل گیا جس کی اس کو تلاش تھی۔ یہ سب کچھ اُسے صبر سے حاصل ہوا تھا اپنے آپ کو دنیا سے لاتعلق کر کے۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اُسے خود اپنے قدموں کی چاپ اجنبی لگ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مانوس بھی مگر مانوس اس طرح جیسے کسی شخص کو دیکھ کر احساس تو ہو کہ ایسے کہیں دیکھا ہے کون ہے پر یہ یاد نہ آ رہا ہو۔ ایک مانوسی اجنبی۔ اب وہ اپنی ہر بات کو اپنے سے الگ کر کے اپنے جسم سے الگ کر کے سوچ رہا تھا۔ اپنے تمام اعمال خوشی کی تلاش۔ پیاس میں کئے گئے اس کو اجنبی لگ رہے تھے۔ زیگریو کی زخمی کھونپڑی سے بھیجے کا باہر نکلنا۔ دنیا سے بلند گھر۔ اس کی بیوی۔ اس کی امیدیں اور اس کے ناخدا سب کچھ اس کے سامنے موجود تھے۔ مگر ان کی اہمیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ جیسے وہ سب صرف یاد رہ جانے والی حکایت ہوں۔ یہ اس کی اپنی زندگی کی حکایت تھیں مگر یوں جیسے کسی اور نے تحریر کی ہوں۔ پہلی مرتبہ اُسے اپنی طبیعت میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ درحقیقت وہ مہم جُو طبیعت کا مالک ہے۔ طاقت کی خواہش دنیا سے تعلق رکھنے کی جبلی قابلیت۔ تعلق بغیر کسی نفرت۔ ناراضگی یا افسوس کے۔ ایک چکنے چٹان پر بیٹھے ہوئے وہ مرمرین پتھر پر ہاتھ پھیر رہا تھا تو اُسے اس چاندنی رات میں لوسی کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا اور اس کے ہونٹوں کی گرمی۔ اوپر چاند اس کی سوچ پر مسکرا رہا تھا۔ نیچے سمندر کی لہریں مچل رہی تھیں۔ مرساں کو اپنی قسمت اور زندگی پر مکمل ہونے کی مہر لگتی دیکھائی دے رہی تھی۔ لہٰذا اب کے بعد سے اس ساری کوشش صرف خوشی حاصل کرنے کے لئے ہوگئی۔ خوشی سب سے بڑی سچائی ہوگی۔ اُسے گرم سمندر میں ڈوب کر اپنے آپ کو کھو دنیا چاہیئے تا کہ اپنے آپ کو دوبارہ پا سکے۔ اُس نے کپڑے اتارے پہاڑی سے نیچے آیا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے جسم کی گرمی اور سمندر کے پانی کی گرمی یک جان ہوگئے۔ چاند کی چاندنی میں نہایا تا کہ ماضی بالکل دھل جائے۔ اس طرح خوشی کے ترانے کو وہ گنگنائے۔ سمندر میں تیرنے کے دوران اس کی جسمانی حرکتوں سے پانی میں ہلچل مچ رہی تھی۔ موسیقی پیدا ہو رہی تھی.. اسی مستی میں وہ ساحل سے کافی نکل گیا۔ اچانک اُسے سمندر کی گہرائی کا خیال آیا۔ سمندر

کے تہہ کی انجانی دنیا اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے سوچا کہ وہ ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دے اور اپنے آپ کو گہرائی کے حوالے کر دے۔ مگر پھر اپنے جسم کے تیرنے کی طاقت پر بھروسہ کر کے اس نے اور زور شور سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ وہ ساحل پر واپس آ گیا۔ اُسے اب سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔ اس نے ساحل پر کپڑے بدلے۔ حالانکہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا مگر وہ خوشی سے ہنس رہا تھا۔

گھر واپسی پر اُسے چکر آ رہے تھے۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ اُس نے چٹانوں کا سہارا لیا۔ جھاڑ جھاڑیوں کو پکڑتے وہ بڑی مشکل سے گھر تک پہنچا۔ اس کا وہ جسم جو ابھی کچھ دیر پہلے اُسے سمندر میں خوشی اور مستی دے رہا تھا اب اُسے دکھ اور کمزوری میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے سوچا شاید چائے پینے سے اُسے کچھ آرام آ جائے گا۔ اُس نے جیسے تیسے گندے سے برتن میں چائے کا پانی ابالا مگر چائے اتنی وہیات بنی کہ اُس نے اس کی طبیعت اور خراب کر دی اب اُسے متلی آ رہی تھی۔ وہ بستر پر پڑ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سینے کو کوئی جکڑ رہا ہو۔ وہ کھانستا رہا۔ بلغم تھوکتا رہا۔ بلغم میں خون کی آمیزش تھی۔ مرساں کے جسم کا ہر حصہ دکھ رہا تھا۔ سردی کی کپکپی اس پر طاری تھی۔ اس کے کان بج رہے تھے۔ ہر طرف سے اُسے شور و غل سنائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا جیسے گھر کے در و دیوار نہ ہوں وہ کسی کھلی جگہ پر ہو اُسے سمندر کے موجوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی بھیانک آوازیں آ رہی تھی۔ اُسے اچانک اب گرمی لگنے لگی۔ اُس نے کمبل اتار پھینکا کبھی گرمی پھر کبھی سردی کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ مرساں سمجھ چکا تھا کہ وہ شدید بیمار ہے۔ اُسے اب اس بات کا خوف تھا کہ وہ شاید اس نیم بے ہوشی کے عالم میں مر جائے گا۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا مگر اس لاچاری کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چلتے پھرتے ہوش و حواس میں مرنا چاہتا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی پر پڑے باریک پردے کے پار وہ آسمان پر تاروں کو دیکھ سکتا تھا۔ لمبی لمبی گہری سانسیں لیتے ہوئے اُس نے کرسی کے بازوؤں کو پکڑے رکھا تاکہ وہ اپنے کانپتے ہوئے جسم پر قابو رکھ سکے۔ اب شاید مر ہی جاؤں گا۔ وہ یہ برابر سوچے جا رہا تھا۔ اُسے احساس ہوا وہ رو رہا ہے۔ اس بیماری نے اُسے کمزور اور بزدل بنا دیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ وہ زندگی کی چاہت سے منہ نہیں موڑنا چاہتا تھا۔ مگر وہ زندگی سے حسد کرنے لگا تھا۔ اُسے الجیر کی وہ شامیں یاد آ رہی تھیں جب آسمان کی اونچائی پر فیکٹروں کے سائرن کی آوازیں چھٹی ہونے پر بلند ہوتی تھیں اور

لوگ ٹولی ٹولی اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوتے تھے۔ اُسے گھنے جنگلوں میں گھومتے ہوئے جنگلی **پھولوں کی خوشبو** یاد آ رہی تھی۔ وہ قدرتی حسن اور اندرونی خوشی کو ترس رہا تھا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے **فرار** ہو کر ابدی نیند سو جانا چاہتا تھا۔ اُسے اچانک کھڑکی میں زیگریو کا چہرہ دیکھائی دیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ چہرہ اُسے ماضی کی یاد دلا کر خوفزدہ کرے۔ اُس پر پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا سانس گھٹ رہی تھی وہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پورا جسم ٹھنڈا گوشت تھا کمبل کو اپنے گرد لپیٹ کر لیٹ گیا تب پھر گرمی نے اُسے ستایا۔ سردی گرمی کا یہ کھیل جاری رہا۔ مکمل بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ اُسنے دیکھا رات ڈھل رہی تھی صبح کی آمد آمد تھی سورج کی کرن کے ساتھ اُسے اپنی زندگی کی کرن محسوس ہوئی۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

پھر جب وہ ہوش میں آیا تو پوری طرح صبح ہو چکی تھی۔ چڑیائیں چہچہا رہی تھیں۔ اُسے یاد آیا کہ آج غالبًا لوسی آئے گی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتا ہرا۔ منہ بدذائقہ ہو رہا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر برنارڈ کو بلا بھیجا۔ وہ فوراً آ گیا ایک مستعد ڈاکٹر کی حیثیت سے اُس نے مرساں کا معائنہ کیا۔ تمہاری حالت بہت خراب ہے مرساں۔ مرساں خاموش رہا۔ ڈاکٹر نے فوراً دو انجکشن لگائے۔ دوسرے انجکشن کے لگتے وقت مرساں پھر بے ہوش ہو گیا۔ مگر پھر جلدی ہی آنکھیں کھول دیں۔ برنارڈ الۂ سے اس کے دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔ تمہارا دل ڈوب رہا ہے۔ اگر دوبارہ غشی طاری ہوئی تو شاید تم پھر ہوش میں نہ آؤ مرساں نے شدِ غم میں آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ خشک اور سفید ہو رہے تھے۔ حلق سے سیٹی کی آواز نکل رہی تھی۔ برنارڈ اس کے منہ سے بڑی مشکل سے ڈاکٹر کا نام نکلا۔ میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا ڈاکٹر ہاں مجھے تمہاری سوچ کا اندازہ ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اُسے انجکشن کی دوا کی کئی شیشیاں دیں۔ اور کہا تم جب بھی کمزوری محسوس کرو ایک شیشی کھول کر پی لینا۔ یہ ایڈریلن ہیں۔ تمہارے لئے تریاق۔ واپسی پر ڈاکٹر کو لوسی راستے میں ملی۔ وہ حسب معمول پہلے کی طرح حسین اور دلکش لگ رہی تھی۔ کیا پیٹرس بہت بیمار ہے لوسی نے ڈاکٹر سے سوال کی۔ ہاں۔ ڈاکٹر نے مختصر طور پر کہا۔ کیا حالات زیادہ خراب ہے نہیں۔ ڈاکٹر نے لوسی کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ہاں بہتر ہوگا کہ تم اُسی تنہا رہنے دو۔ لوسی سوچتی رہ گئی کہ اس سے ڈاکٹر کا کیا مطلب ہے مرساں سارا دن کھانستا رہا۔ گھٹن محسوس کرتا رہا۔ دو مرتبہ نیم بے ہوشی طاری ہوئی۔ کچھ ہوش میں آتے ہی اُس نے ایڈریلین پی لی۔ لوسی اس کے کمرے میں آتی جاتی رہی۔ مرساں کو قدرے

ہوش میں دیکھ کر وہ بستر کے قریب آئی۔ مسکرائی اور مرساں کو پیار کیا۔ مرساں کے چہرے پر جان سی آئی۔ تم رک جاؤ نا۔ مرساں نے لوسی سے کہا۔ شام برنارڈ پھر آیا انجکشن دیا اور چلا گیا۔ آسمان پر سرخ بادل منڈلا رہے تھے۔ اُس نے تکیہ سے ٹیک لگا کر لوسی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ جب میں بچہ تھا تو میری ماں مجھے بتاتی تھی کہ یہ سرخ بادل دراصل مرے ہوئے لوگوں کی روح ہیں جو جنت کی طرف جارہی ہیں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ روحیں سرخ ہیں۔ مجھے اب پتہ لگا کہ دراصل یہ سرخ بادل آنے والے کسی طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ مگر میں پھر بھی حیران ہوں۔ دن گزرا۔ پھر رات آرہی تھی۔ اب مرساں کو ڈر لگ رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے خوفناک بھیانک مکروہ مشکلیں ابھریں گی ان ہی میں زیگریو کا چہرہ بھی ہوگا۔ سارے خوفناک چہرے ایک ایک کر کے غائب ہوجائیں گے مگر زیگریو کا چہرہ موجود رہے گا۔ ابھی تک وہ اپنی زندگی بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے گزار رہا تھا مگر اب جیسے زندگی تھم گئی تھی۔ سانس لے رہا تھا مگر زندگی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ دل و دماغ میں زندگی کی الٹی فلم چل رہی تھی۔ گزرے ہوئے ایک ایک لمحات آنکھوں سے سامنے آرہے تھے جن سے فرار ممکن نہیں تھا۔ زندگی جو اس کے لئے اب سے پہلے شاعری کی مانند تھی جس میں نغمگی تھی مگر اب کچھ نہیں بچا تھا۔ سوائے صاف شفاف سچائی جو شاعری اور نغمگی سے بالکل مختلف تھی۔ زندگی میں جن جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا وہ سب کے سب اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کے لئے زندگی سے جڑے رہنا موت سے بدتر تھا۔

وہ اسی کشمکش اور گومگوں کے عالم ایک دن اور رات گزار چکا تھا۔ وہ بستر پر ہی بیٹھا رہا۔ لیٹ کر وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ لوسی بھی اُسی کے ساتھ بیٹھی رہی۔ دنوں کے درمیاں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ مرساں اس کی طرف دیکھ کر سوچتا کہ اس کے چلے جانے کے بعد جو پہلا شخص اس کو اپنی بانہوں میں لے گا وہ کتنا بھاگوان ہوگا۔ یہ بھی نرم پڑ کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے گی۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اس نے مجھے اپنے حوالے کیا تھا۔ اور دنیا جاری وساری رہے گی اس کے جسم کی گرمی کے ساتھ۔ پھر کبھی کبھی وہ اپنی گردن اٹھا کر باہر کھڑکی سے جھانکتا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے، داڑی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ اس نے اپنی نظریں لوسی کی طرف کیں اور مسکرایا۔

کیا اب تم بہتر محسوس کر رہے ہو۔ لوسی نے سرگوشی میں پوچھا۔ صرف ہاں کہہ کر وہ پھر اپنے اندھیروں میں کھو گیا۔

اُسی پوری طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے شعوری طور پر زیگریو کو اپنے خیالات میں لانے کی کوشش کی۔ زیگریو کی مسکراہٹ نے کس طرح پہلی مرتبہ اس کے دل کو غصہ اور نفرت سے بھر دیا تھا۔

اپنے تعلقات پر غور کرتے ہوئے مرساں کو زیگریو پر نفرت غصہ کے ساتھ ساتھ پیار اور ترس بھی آرہا تھا۔ اچانک اُسے زیگریو پر اس کی احسان مندی کے حوالے سے ایک زبردست جذبہ پیدا ہوا۔ حالانکہ مرساں نے اس کا قتل کیا تھا۔ مگر اس جرم نے اس قتل نے اس کو زیگریو کے ساتھ نہ ختم ہونے والا تعلق پیدا کر دیا تھا۔ وہ بے قابو آنسو جو اس کی آنکھوں میں جمع ہو کر بہنے کو بے قرار تھے۔ ان آنکھوں میں زندگی کی رمق کے ساتھ اس کے منہ میں زندگی اور موت کا بہ یک وقت ذائقہ پیدا کر رہے تھے۔ زیگریو نے بھی اپنی معزوری کے ساتھ زندہ رہتے ہوئے اسی طرح زندگی اور موت کا مزہ چکھا ہوگا۔ جیسا کہ مرساں کی خواہش تھی۔ کہ وہ آنکھ کھولے موت کو گلے لگائے۔ بالکل اُسی طرح جیسے زیگریو کی آنکھیں اُس روز کھلی ہوئی تھیں اور آنسو بہہ رہے تھے۔ مگر شاید اس طرح کی موت بزدلوں کی ہوتی ہے جنہوں نے زندگی سے اپنا حصہ حاصل نہیں کیا ہوتا۔ پیٹرس مرساں کو کسی ایسی کمزوری کا ڈر نہیں تھا۔ بخار کی اس شدت میں جبکہ اس کے جسم کا خون گردش کی کمی کے باعث جسم کے ہر حصہ میں نہیں پہنچ رہا تھا پھر بھی وہ ذہنی طور پر اپنے کو ناتواں سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی کا رول ادا کر چکا تھا اور خوب طور پر ادا کر چکا تھا۔ اپنے آپ کو خوش رکھ چکا تھا۔ اس کے اپنے اندر کا ہمزاد اُسے جھنجھوڑتا رہا تھا مگر اُس نے اس پر قابو پالیا تھا۔

اسی سوچ بچار میں اس کے اوپر سے کمبل سرک گیا تھا۔ لوسی نے اٹھ کر کمبل درست کرنے کی کوشش کی۔ لوسی کی لمس سے اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اس لرزہ میں وہ کانپتا رہا۔ تھرتھراتا رہا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اُس دن سے جب زیگریو کے قتل کے بعد اُسے چور ہے میں زیگریو والا کے قریب چھینک آئی تھی آج تک اس کے جسم نے اس کا ذمہ داری سے ساتھ دیا تھا۔ اس کے اس خاکی جسم نے زندگی میں مزہ پیدا کیا تھا۔ مگر اس کا جسم اپنی الگ زندگی بسر کر رہا تھا۔ مرساں کی ذات سے الگ۔ ادھر کچھ عرصہ سے اس کا جسم آہستہ آہستہ کمزور پڑتا جارہا تھا۔ بکھر رہا تھا۔ اور اب اس کا جسم اپنا سفر پورا کر چکا تھا اور مرساں کو چھوڑنے پر مجبور تھا تا کہ اُسے مکتی حاصل ہو جائے۔ ابھی لوسی کی لمس نے اس کے جسم میں جو ایک کپکپی پیدا کی تھی وہ ظاہر کرتی تھی کہ مرساں اور اس کے جسم میں ابھی تعلق قائم ہے۔ وہ تعلق جس سے مرساں اور اس کے جسم کو کتنی خوشیاں دی

تھیں۔بس یہ ہی سوچ کر مرساں نے اس تھرتھرانے کا مزہ لیا۔اُسے ہوش میں رہنا چاہئے بغیر فریب کھائے بغیر بزدل بنے موت کا سامنا روبرو۔جسم کو قابو میں رکھتے ہوئے۔موت مگر کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ایک مرد کا یہ ہی کام ہے۔مرساں اپنی زندگی کا آخری پتا بہت خوش دلی سے کھیلنا چاہتا تھا۔حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ اس کے پاس اب کوئی تڑوپ کا پتا نہیں ہے جو اُسے شکست سے بچا سکے وہ زندگی کا کھیل ہار رہا تھا۔اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔وہ سانس کے لئے منہ کھول کر لمبی لمبی سانسیں بھر رہا تھا۔اس کے کمزور پھیپھڑے جواب دے رہے۔موت کی سیٹی بج رہی تھی۔ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان میں کوئی حس باقی نہیں تھی۔

نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ٹھنڈک تھی۔چڑیاں چہچہا رہی تھیں سورج جلدی بلندی پر آ گیا افق سے اوپر۔سورج کی سنہری چمک پھیلی ہوئی تھی۔آسمان اور سمندر کے درمیان روشنیوں کا کھیل جاری تھا۔کھلی کھڑکی سے سمندر کی نمکین مرطوب ہوا اندر آ رہی تھی۔دوپہر تک ہوا کا زور کچھ کم ہو گیا تھا۔دن پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔سمندر کے پانی پر سورج کی تیز روشنی مانند کندن چمک رہی تھی۔فضا میں ایک مخصوص معطر مہک پھیلی ہوئی تھی۔مرساں کے جسم میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔اس سحر انگیز ماحول سے اس کی ڈوبتی آنکھیں نیم وا تھیں۔اچانک اُسے احساس ہوا کہ وہ بستر پر بیٹھا ہے۔لوسی کا چہرہ اس کے قریب تھا۔آہستہ مگر واضح طور پر اُسے لگا جیسے کوئی وزن دار شے مانند پتھر اس کے پیٹ سے ابھر کر اس کے حلق میں آ کر پھنس گیا ہو۔اُس نے بہت تیزی سے سانس لینی شروع کر دی۔اُس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے لوسی کی طرف دیکھا۔پھر اُس نے ایک جھرجھری لی اور اپنے آپ کو بستر پر گرا لیا۔اُسے اپنا وجود اوپر کی جانب اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے لوسی کے کپکپاتے ہونٹ دیکھے اور اس کے پیچھے دنیا کی ہنسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آنکھیں پتھرا گئیں۔

پیٹرس مرساں کی ان پتھرآنکھوں میں ’’موت کی خوشی‘‘ کی چمک تھی۔

ختم شد



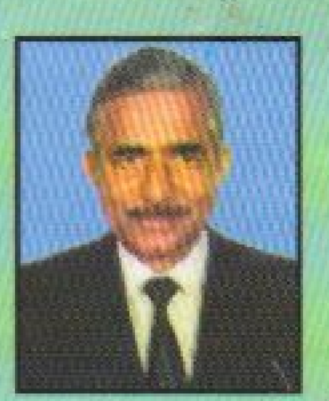
"کیا موت کی خوشی ممکن ہے؟"

یہ سوال البرٹ کامیو (Albert Camus) کی کتاب A Happy Death کا مرکزی خیال ہے۔ جس کا جواب اس نے دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب مصنف کی موت کے بعد شائع ہوئی اور دنیا نے اسے ایک عظیم ادبی کارنامے کے طور پر لیا۔ کامیو فرانسیسی زبان کا لکھاری تھا۔ مغربی ادبی دنیا میں ایک بڑا نام ۔ A Happy Death کا انگریزی ترجمہ Richard Howard نے کیا اور انگریزی ترجمہ سے اسے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مختلف زاویے سے اس کتاب پر غور کیا جاسکتا ہے۔ البرٹ کامیو کی مشہور کتاب Outsider کے پہلے خاکے یا پھر ایک سوانح ناول کے طور پر یہ ایک عمدہ تحریر ہے۔

کتاب کا آغاز ایک قتل سے ہوتا ہے اور ختم مرکزی کردار پیٹرس میں مرساں کی موت پر ہوتا ہے۔ درمیان میں مرساں کی الجیریا میں گزری ہوئی زندگی کا احوال ہے۔ مارتھا اور پُراسرار لنگڑائے زیگریو سے تعلقات کا تذکرہ۔ زیگریو کے قتل کے بعد وہ پراگ بھاگ جاتا ہے۔ پھر وسطی یورپ کا چکر کاٹ کر الجیر واپس آتا ہے۔ اس کی زندگی کے دوسرے کردار کیتھرین، روز اور آخر میں لوسی کے علاوہ دیگر کردار اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ مصنف نے مرساں کی دوسری زندگی کے تجربہ کو فلسفیانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ وہ کیسے مجلسی زندگی اور جوگی بن کر خوشی کی تلاش کرتا ہے۔ آخر کار اس نے خوشی کو اپنے طور پر پالیا اور اپنی موت میں بھی اسے برقرار رکھا۔ کیسے یہ آپ "موت کی خوشی" کو پڑھ کر سمجھ سکیں گے۔

البرٹ کامیو 1913 میں الجیریا میں پیدا ہوا۔ وہ ماں باپ کی طرف سے فرانسیسی اور ہسپانوی نژاد تھا۔ شمالی افریقہ میں وہ پلا بڑھا۔ وہ مختلف کام کرتا رہا۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ وہ الجیریا کی فٹ بال ٹیم کا گول کیپر بھی رہا تھا۔ فرانس آ کر اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ جرمن کے فرانس پر قبضہ کے دوران وہ بہت متحرک تھا اور مشہور اخبار Combat کا اڈیٹر ہو گیا تھا۔ جنگ سے پہلے 1931 میں اس نے ایک تمثیل Coligula کے نام سے تحریر کیا۔ اور پھر جنگ کے دوران اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔

Etrange اور Le mythe de sisphe۔ صحافت اور سیاست کو اس نے خیر باد کہہ کر پوری توجہ لکھنے پر لگا دی۔ اور پوری دنیا میں نام پیدا کیا۔ یکے بعد دیگرے اس کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔ ادب کا نوبل انعام اسے 1957 میں عطا کیا گیا۔ جنوری 1960ء میں ایک سڑک کے حادثہ میں اس کا انتقال ہوا۔



مترجم: ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی

والدِ محترم: حافظ فصیح اللہ (مرحوم) ملیٹری اسٹیٹ آفیسر۔

آبائی وطن: الٰہ آباد (یوپی) وطن عزیز: کراچی (پاکستان)

تعلیم: ملت ہائی اسکول۔ گورنمنٹ ایمرسن کالج۔ ملتان

مشاغل: مطالعہ، تصنیف و تالیف، ناول، افسانے، ڈرامے، کالم نگاری، ریڈیو براڈ کاسٹنگ، اسٹیج، ٹی وی، اداکاری، بچکانہ کھیل و تفریح بطور دادا نانا۔

سفر برائے ظفر: حرمین شریفین۔ بھارت۔ بنگلہ دیش۔ یورپ۔ امریکہ۔ کینڈا

ادبی سرپرستی: اختر حامد خان / پروفیسر آفاق صدیقی

تصنیفات: متعدد ناولیں (اخبار جہاں اور ڈر ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہوئیں) یہ انکی ترجمہ شدہ پہلی کاوش ہے مزید کام جاری ہے۔